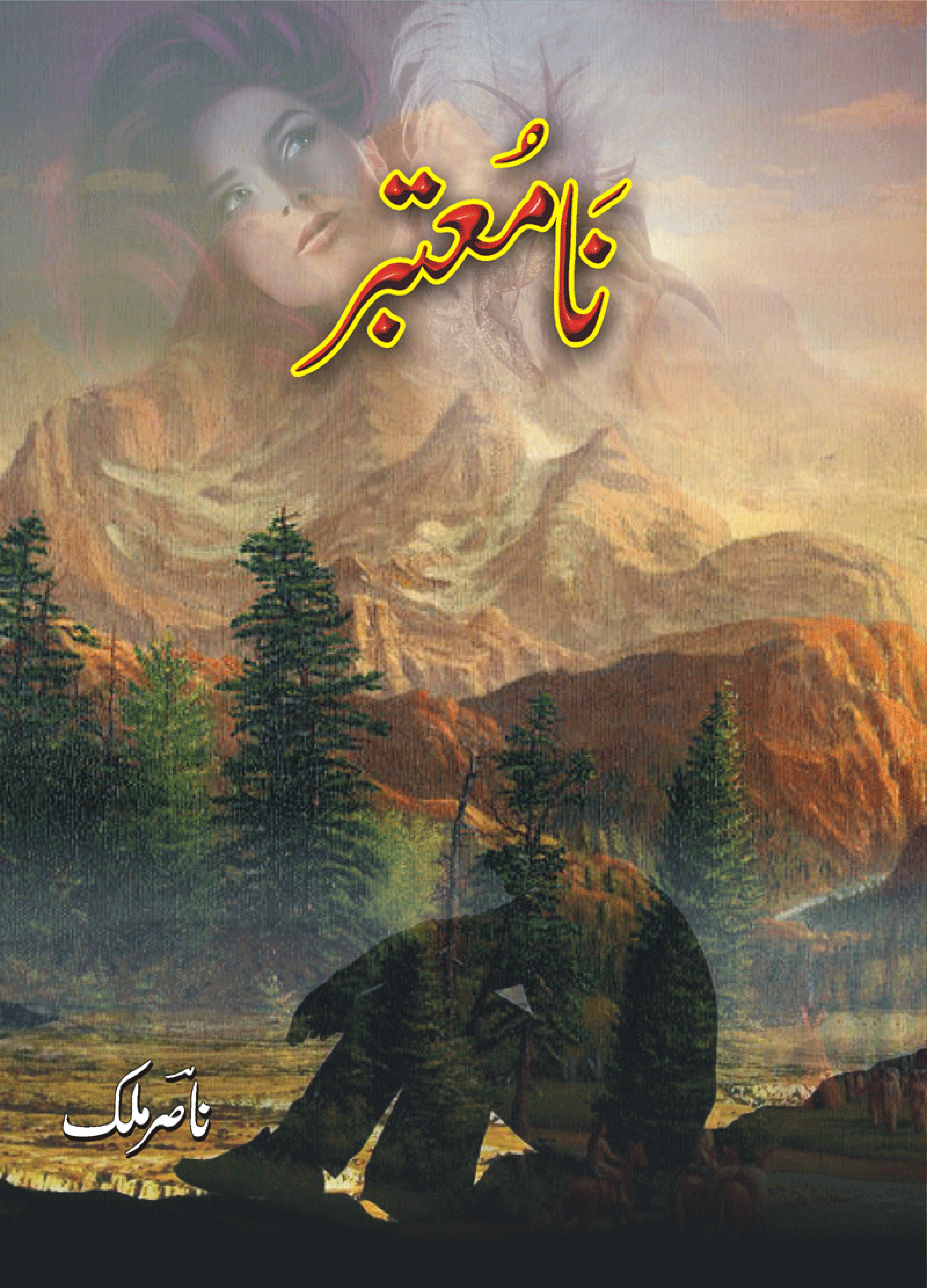

نامُعتبر
ناصر ملک

XXX

# نامعتبر

## ناصر ملک

گاڑی کا دروازہ کھلتے ہی اُسے ماحول میں حد سے بڑھی ہوئی خنکی کا احساس ہوا۔ جسم کو چیرنے والی یخ بستہ ہوا نے اسے آنِ واحد میں کپکپا کر رکھ دیا۔ اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا، ''اوہ میرے خدا! اب کیا ہوگا؟'' اس نے آہستگی سے دروازہ بند کیا اور اسٹین لیس اسٹیل کے بمپر پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے غیر ارادی طور پر بغلوں میں ہاتھ داب لیے تھے۔ تاحدِ نگاہ دبیز دھند جیسے بادل، طویل قامت درختوں کے سبز گیں ہیولے، چند گام تک دکھائی دینے والی تارکول کی روایتی سڑک اور پھر دور تک اس کا موہوم عکس ماحول میں رچی سنجیدگی آمیز سردی کا احساس دلا رہے تھے۔ نومبر کے وسط میں اس پہاڑی علاقے کا رخ محض وہی لوگ کرتے تھے جن کی زندگی یہاں گزرتی تھی۔ موسمِ گرما میں ہزاروں کی تعداد میں ادھر آنے والے سیاحوں میں سے اِکا دُکا برف باری کا نظارہ کرنے اس طرف آنکلتے تھے مگر وہ اس یخ بستگی سے نبٹنے کے لئے کیل کانٹوں سے لیس ہوا کرتے تھے۔

وہ بمشکل دومنٹ اسی حالت میں کھڑا موڑ، اس کے بعد آنے والی اُترائی میں چھائے ہوئے اندھیرے کو گھورتا رہا اور کچھ سوچتا رہا پھر خود کو سنبھالا دینے کیلئے بلند آواز میں چیخا،''اے میرے خوب صورت جنگل! اے میرے سندر بن! میں سردی کے ڈر سے تم سے دور رہنے والا نہیں ہوں۔تم جانتے ہو کہ بچپن سے ہی بہت ضدی واقع ہوا ہوں۔یہ بھی جانتے ہو کہ مجھے تمہاری سردی کچھ نہیں کہتی۔ مجھے ویلکم کہو۔میں اپنے بابا سے ملنے کئی برسوں بعد تمہاری گود میں آرہا ہوں۔''

وہ پلٹ کر گاڑی میں آبیٹھا۔پرانے ماڈل کی فور ویل جیپ کا انجن خراب ہو گیا تھا۔ہیٹر بند ہو چکا تھا۔چند منٹ قبل دھندلے شیشوں والی اس جیپ کا اندر گرم تھا۔اب ٹھنڈا ہونے لگا تھا۔اس نے اتمامِ حجت کے طور پر اگنیشن میں چابی گھمائی۔انجن گھرگھرا کر خاموش ہو گیا۔اس نے پھر ٹرائی کی۔کامیابی نہیں ہوئی۔

گاڑی کے بعد موبائل فون نے بھی مایوس کر دیا۔سگنلز کا انڈیکیٹر معدوم تھا۔یہ نئی بات نہیں تھی۔ پہلے بھی یہی حالات ہوا کرتے تھے۔نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا، لاپروائی سے سر جھٹکا اور عقبی حصے سے فر کا لانگ کوٹ کھینچ لیا۔پچھلی نشست پر بے ترتیب پڑی جرابیں اور دستانے بھی اٹھا لیے۔جب وہ شولڈر بیگ اٹھائے گاڑی سے نکلا تو کسی گیت کی دھن پر سیٹی بجا رہا تھا۔سیٹی کی آواز اسے سنائی نہیں دے رہی تھی مگر احساس کو فرحت بخش رہی تھی۔اس نے جیپ کے بڈ پر ہاتھ پھیرا، بے سبب مسکرایا اور زیرلب بولا،''گڈ بائی جانی! اگر مجھے کوئی مستری مل گیا تو کل ملاقات ہو گی۔یقیناً تم اداس نہیں ہو گی۔ویسے بھی تمہیں خریدنے کا میرا فیصلہ ہی غلط تھا۔تم بوڑھی ہو گئی ہو۔تمہاری تو کن منی ہی حرام میں گئی۔''

اس نے یہ گاڑی آج ہی راولپنڈی کے ایک شوروم سے خریدی تھی۔بیچنے والے اور شوروم کے ایجنٹ نے اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے تھے۔بیچنے والے کا تعلق بلتستان سے تھا۔اس نے کہا تھا،''دوست! میں کبھی فوکر پر سوار ہو کر اپنے وطن نہیں گیا۔اسی جیپ پر جاتا ہوں۔دو دِنوں میں پہنچ جاتا ہوں۔آج تک یہ راستے میں خراب ہو کر نہیں رکی۔''

شوروم پر ہونے والی گفتگو یاد آنے پر وہ دل ہی دل میں ہنسا۔بھلا یہ گاڑی جو راولپنڈی سے اس کے آبائی گاؤں سندر بن تک پہنچ نہیں پائی تھی، وہ بلتستان اور گلگت کیسے پہنچتی ہوگی۔اس کا انجن مسلسل چڑھائی کی وجہ سے گرم ہو گیا تھا۔باوجود کہ اس نے چھرا پانی پر رک کر انجن میں پانی ڈالا تھا۔کچھ دیر پہلے تک وہ بالکل ٹھیک تھی۔اس نے تھرمواسٹیٹ میٹر دیکھا تھا۔جونہی اس نے کشمیر روڈ چھوڑا، گاڑی کا ہیٹ انڈیکیٹر خطرے کی گھنٹی بجانے لگا تھا۔بانسرہ گلی میں اس نے تھوڑی دیر قیام کیا۔سوئی نارمل کلر رینج میں آئی تو اس نے اپنا سفر شروع کیا۔اس دوران اس نے قہوے کا ایک کپ بھی حلق میں اتارا تھا۔کراچی میں پانچ سالہ قیام کے دوران اسے یہ ذائقہ نصیب نہیں ہوا تھا۔

گرم لباس پہننے سے سردی پہلی سی نہیں رہی تھی حالانکہ وہ پہلی سی ہی تھی۔ بیگ کندھے پر ڈال کر وہ آہستہ روی سے سڑک کے وسط میں چلنے لگا۔شکر تھا کہ اس کی جیپ پہاڑی کی چوٹی پر خراب ہوئی تھی اور وہ چڑھائی کے مشکل سفر سے بچ گیا تھا۔اب اس کے سامنے اترائی کا سفر تھا جس پر قدم روک روک کر چلنا تھا۔اس کا گھر یہاں سے دو اڑھائی کلومیٹر کے فاصلے پر اترائی میں واقع سندر بن نامی قصبے میں تھا مگر اسے سڑک کے گھماؤ پھراؤ کے سبب سات آٹھ کلومیٹر چلنا تھا۔اس موسم میں وہ پختہ سڑک چھوڑ کر شارٹ کٹ راستہ لینے کا خطرہ مول لینے پر تیار نہیں تھا۔

زگ زیگ سڑک دو تین موڑ مڑنے کے بعد تقریباً نصف کلومیٹر تک ایک سیدھ میں چلی جاتی تھی۔ چونکہ اس وقت اس سڑک پر کسی بھی گاڑی کے آنے کا امکان نہیں تھا، اس لیے وہ لاپروائی سے گیارہ فٹ چوڑی سڑک کے بیچوں بیچ ٹہلنے کے انداز میں چل رہا تھا۔ سڑک نے پھر زگ زیگ شکل اختیار کر لی تھی۔

سردی نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔اس کی ٹانگیں شل ہونے لگیں۔اس نے بڑبڑا کر اپنی صفائی پیش کی،"کافی عرصے بعد ادھر آیا ہوں ناں......اس لیے سردی لگ رہی ہے۔تھوڑی ہی دیر میں عادی ہو جاؤں گا پھر سردی نہیں لگے گی۔"

دائیں ہاتھ وہی پہاڑی تھی جس پر سے وہ اتر رہا تھا جبکہ بائیں جانب سڑک کے کنارے کے ساتھ طویل قامت درختوں کے بالائی آدھے دھڑ جڑے ہوئے تھے۔ پائن کے یہ درخت سڑک سے کہیں نیچے ایستادہ تھے۔اگر سردی اور رات کا عالم نہ ہوتا تو وہ اپنی عادت کے مطابق کسی درخت پر سے پھسل کر آن کی آن میں نیچے چلا جاتا اور ایک کلومیٹر کی مسافت بچا لیتا۔

اگلے چند منٹوں میں وہ مزید بوجھل ہو گیا۔سانس پھول گئی۔رک گیا۔سڑک کے کنارے رکھے بنچ نما سفید پتھر پر بیٹھ گیا۔لانگ کوٹ کے نیچے قمیص کی جیب سے سگریٹ کیس اور لائٹر نکالنے میں تھوڑی دقت پیش آئی۔کیپ کے ٹچ بٹن کھول کر منہ اور ناک باہر نکالی اور سگریٹ سلگا کر لمبے لمبے کش لینے لگا۔گرم دھوئیں نے کسی حد تک حدت کا احساس بخشا مگر وہ جانتا تھا کہ یہ احساس نہایت عارضی ہے۔قدرے بیزاری سے بڑبڑایا،"کم بخت جیپ کو بھی یہیں آ کر خراب ہونا تھا۔اس وقت گھر جانے کے لئے مجھے کوئی سواری نہیں مل سکتی۔"

موبائل فون نکالا،کوئی بٹن پش کر کے سکرین روشن کی اور وقت دیکھا۔ایک بجے کا عمل تھا۔یہاں تو چھ بجے ہی رات ہو جایا کرتی تھی۔وہ بلاوجہ فون کی کنٹیکٹ لسٹ دیکھنے لگا۔اس علاقے میں اکثر و بیشتر سیلولر نیٹ ورک کام کرنا چھوڑ دیتا تھا۔ٹورازم کے حوالے سے عالمی سطح پر شہرت رکھنے والے اس قصبے کا دنیا سے مواصلاتی رابطہ مستقلاً بحال نہیں رہتا تھا۔سندر بن کے لوگ قریبی قصبے میں جا کر بانسرہ گلی کے کال آفس سے فون کیا کرتے تھے۔اپنے گاؤں کی بہ یک وقت شہرت اور حد درجہ پسماندگی کے بارے سوچتے ہوئے سگریٹ

کے کش پر کش لینے لگا۔ ایسے ہی وقت میں وہ بری طرح چونک گیا۔

اسے سڑک کے کنارے بارشوں سے پیدا ہونے والے ایک قدیمی کٹاؤ میں حرکت کا احساس ہوا۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے پتلیوں پر ٹھہری ہوئی نمی کو پونچھا اور آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ اس کٹاؤ کے اندر کوئی تھا جو سڑک پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا فوری طور پر خیال بندروں کی طرف گیا کیونکہ اس علاقے کے درختوں اور گنجان پھولدار جھاڑیوں سے ڈھکی گھاٹیوں پر عملی طور پر شریر بندروں کا راج تھا۔ پھر اس نے اپنا خیال آپ ہی رد کر دیا۔ اتنی سردی میں بندر اپنی گپھاؤں سے نکلنے کی جرات نہیں کیا کرتے تھے۔ اس نے کٹاؤ پر آنکھیں جمائے رکھیں اور سیگرٹ کو اپنے کیل دار جاگرز تلے روند کر جلدی جلدی دستانہ پہننے لگا۔

اسے گہری دھند اور اندھیرے کی وجہ سے سڑک کنارے کٹاؤ میں ہونے والی حرکت نے مضطرب کر دیا تھا۔ وہ اگر بندر نہیں تھا تو یقینی طور پر بھیڑیا تھا۔ لومڑ، جنگلی سور یا گیدڑ بھی ہوسکتا تھا۔ اسے علم تھا کہ بھیڑیے جوڑے کی صورت میں شکار پر نکلتے ہیں اور ویرانے میں انسان پر حملہ آور ہونے سے ذرہ بھر نہیں ہچکچاتے۔

ایسے ہی وقت میں کہر نما بادلوں کی تیز لہر اس کے اور ہیولے کے بیچ حائل ہوگئی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیا تو وہ ایک ذرا تھم گیا۔ دبیز دھند گویا وہیں ٹھہر گئی۔ نہ دکھائی دینے والی شئے ڈراتی ہے۔ وہ بھی ڈرنے لگا۔ اس کے اعصاب شکاری جانور کی طرح تن گئے۔ مبادا کسی لمحے کچھ ہو جائے۔ اس نے اپنے پیروں کے آس پاس دیکھا۔ فوری اسلحے کے طور پر کوئی پتھر نظر نہ آیا۔ پھر محتاط انداز میں دبے پاؤں چلتا ہوا سڑک کی دوسری سمت بڑھا۔ اس طرف چونکہ پہاڑی تھی، اس لیے کسی بھی ناگہانی صورت حال میں اس کا پستی میں گرنے کا خطرہ نہیں رہتا تھا۔ اس دھرتی کی بے محابا ناہمواریوں نے اس کی زندگی کو انہی احتیاطوں سے روشناس کرا رکھا تھا۔

اس نے ایک عمودی چٹان سے کمر ٹکائی۔ کان لگا کر سن گن لینے کی کوشش کی۔ تیز سرسراتی ہوا، سر بہ فلک درختوں کے پتوں کا شور اور اپنی متجاوز دھڑکنوں میں کچھ سنائی نہ دیا۔ وہ خود کو نچنت رکھنے کے لئے بڑبڑایا، ''نہیں یار! کیا ضروری ہے کہ وہ بھیڑیا ہی ہو۔ بندر بھی تو ہوسکتا ہے۔''

جنگلی بھیڑیوں کا جوڑا رات کے اس پہر اس کے لئے نہایت خطرناک ثابت ہوسکتا تھا، اسے اس کا بخوبی علم تھا۔ ایسے حالات میں اپنے آپ کو پرسکون رکھنا ضروری تھا۔ اس کوشش میں اس نے پھر سیگرٹ نکالی۔ طلب کے بغیر سلگائی اور لائٹر ہاتھ میں تھامے رکھا۔ اس کے پیندے پر ننھا سا بلب نصب تھا جو بوقتِ ضرورت ٹارچ کا کام دیتا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس ناکافی روشنی سے وہ کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا، اس نے لائٹر ٹارچ روشن کر دی۔ بیم کا رخ کٹاؤ کی طرف کیا۔ ایک طویل سانس لے کر ٹارچ بند کر دی کیونکہ اس کی روشنی محض دو اڑھائی فٹ تک فضا کو ناکافی حد تک روشن کر سکی تھی۔

گومگو کی کیفیت میں پانچ سات منٹ گزر گئے۔ نہ دھند کی دبیز تہہ چھٹی، نہ بھیڑیے کی طرف سے کوئی سرگرمی دکھائی دی تو وہ جھنجلا گیا۔ ہمیشہ جھنجلاہٹ میں اندھادھند اقدامات کیا کرتا تھا۔ اس لمحے بھی اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ چٹان کی ٹیک چھوڑی اور کٹاؤ کی طرف تیز قدموں سے چل پڑا۔ ذہن کو اندیشوں میں گھرا رکھ کر خود کو مزید کمزور کرنے سے بہتر تھا کہ وہ دیوانہ وار یلغار کر کے دشمن کے سر پر پہنچ جاتا۔ خود کلامی کے سے انداز میں بولا، ''اچھا یار! اللہ نبی وارث ہے۔ جو رات قبر میں ہے وہ باہر نہیں گزاری جاسکتی۔''

اندازے کے تحت عین کٹاؤ والی جگہ پر پہنچ کر رک گیا۔ سڑک کے نیچے گہرے اندھیرے اور دھند کی سفید لہراتی لپٹوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے لائٹر ٹارچ روشن کی۔ روشنی کا ننھا سا ہالا کٹاؤ پر پھینکا۔ تربوز کے سائز کا سیاہ گولا دکھائی دیا۔ یہ بھیڑیا یا بندر نہیں ہوسکتا تھا البتہ ریچھ کا بچہ کٹاؤ میں پھنسا ہوسکتا تھا۔ ریچھ اس وادی میں نہیں تھے۔ پھر یہ کیا تھا؟...... یہ دیکھنے کیلئے وہ پیروں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ سیاہ گولے کے دونوں اطراف میں پتھر پر دو انسانی ہاتھ چپکے دیکھ کر چونک گیا۔ وہ فوری طور پر سمجھ گیا کہ سیاہ گولا کسی انسان کا سر تھا۔ آنکھیں مزید پھیلائیں تو یہ بھی احساس ہوگیا کہ وہ کسی عورت کا سر اور ہاتھ تھے۔ وہ سڑک کے ٹوٹے ہوئے کنارے پر نصب پتھر پر ہاتھ جما کر سڑک پر چڑھنا چاہتی تھی مگر کسی وجہ سے تھم گئی۔ اس غیر معمولی سردی میں اس کا اکڑ جانا یا ٹھٹھر کر مرجانا زیادہ حیران کن نہیں تھا۔ اس نے سگریٹ پھینکی اور جلدی سے اس عورت کے ایک ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ شاید ماحول کی تمام تر خنکی اس ننھے سے خاک آلود ہاتھ میں سمٹ آئی تھی۔ اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا، ''اوہ میرے خدا! یہ تو مر گئی ہے۔''

اس نے اپنا دوسرا دستانہ اتارا، چشمِ زدن میں عورت کے دونوں ہاتھ پکڑے اور اسے اوپر کھینچ لیا۔ فی الفور یہ تعین نہ کر سکا کہ وہ بے جان تھی یا بے ہوش...... چند لمحوں بعد وہ سڑک کے کھردرے کنارے پر سیدھی تار پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بدن میں کوئی حرکت نہ دیکھ کر اس کے مددگار نے نبض ٹٹولی۔ محسوس نہ ہوئی تو سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ خوشی ہوئی کہ وہ ابھی تک زندہ تھی مگر زیادہ دیر زندہ رہتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس کے چہرے پر روشنی ڈالی تو آنکھیں ایک دم فرطِ حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ عورت نہیں، نہایت خوبصورت، جواں اور بھرپور لڑکی تھی جس کے جاندار نقوش کسی بھی دل کی دنیا کو آنِ واحد میں اتھل پتھل کر دینے کی طاقت رکھتے تھے۔ رنگت سرخی آمیز گوری رہی تھی جو اس وقت سردی کے سبب نیلگوں مائل ہو رہی تھی۔ چہرے اور گردن پر جابجا خراشیں، مٹی سے لتھڑا مگر جدید وضع کا مختصر لباس، تراشیدہ مگر اس سمے بے ہنگم نظر آتے مٹی سے اَٹے ہوئے بال...... وہ بے ساختہ بڑبڑایا، ''نہیں یار! یہ ادھر کی نہیں ہے۔ کہیں اوپر سے اتری ہے۔ شاید جنت سے اتری ہے مگر بھٹک کر کیچڑ میں پھنس گئی ہے۔''

اپنی توجہ اس کے نیگوں ہونٹوں سے ہٹا کر اس کے تصویری وجود کا جائزہ لینے لگا۔ چند لمحوں بعد وہ اسے ہوش میں لانے کی کوششیں کرنے لگا۔ ایسے میں اس کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ وہ کون تھی اور اس علاقے میں کیا کر رہی تھی؟...... جلد

ہی وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ وہ کوئی ٹورسٹ تھی۔اپنی نیلگوں مائل گلابیں رنگت کی بدولت یورپین لگتی تھی۔آسٹریلین بھی ہوسکتی تھی۔ عادتاً بڑبڑایا،''یہ یورپین لوگ بھی الو کے پٹھے ہوتے ہیں۔کوئی پوچھے تو بھلا کہ رات کی اس جان لیوا سردی میں یہ کیا اپنی ماں کا سر تلاش کرنے نکلی تھی؟''

اس نے لڑکی کے گال تھپتھپائے۔دونوں ہتھیلیوں کو باری باری رگڑا۔اپنی حدت اس کے سرد بدن میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ ناکام رہا۔وہ ہوش میں آئی نہ اس کے بدن میں موہوم سی حرکت ہی پیدا ہوئی۔وہ اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دھڑکن ماپتے ہوئے بڑبڑایا،''گرم کپڑے تو پہن کر نکلتی۔چلو گرم نہیں تھے تو کم سے کم پورے تو ہوتے......بے حیا کہیں کی......اب سردی کا مزہ آگیا ناں؟''

اس کی بے ہوشی میں طوالت نے اسے قدرے پریشان کر دیا۔اس کے گالوں پر قدرے زور سے چپتیں مارتے ہوئے بلند آواز میں بولا،''اے لڑکی! اوئے......ہوش میں آؤ......اوئے!''

اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔خفت آمیز انداز میں ہنسا۔پھر سنبھل کر اس کے سر کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے بولا،''نہیں یار! اب یہ یورپین لڑکی اُردو زبان کو کیا خاک سمجھے گی۔انگریزی بولنا پڑے گی۔ہیلو! آر یو لسننگ؟......کم آن ٹو دی لائف...... ہری اَپ!''

اس نے انگریزی بھی نہ سنی، نہ سمجھی۔وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہوگیا۔لڑکی کو فی الفور گرم جگہ پر لے جانا ضروری تھا۔آن کی آن میں اس نے اگلا اور پچھلا سفر ماپا۔اگر اسے اٹھا کر جیپ میں لے جاتا تو کسی حد تک سردی سے محفوظ کر سکتا تھا۔مگر پھر خیال آیا کہ اتنی دیر میں تو گاڑی کا اندرونی اور بیرونی ماحول ایک جیسا ہو چکا ہوگا۔گھر کا سفر زیادہ تھا۔وہ لڑکی کو کندھے پر اُٹھائے آدھ یا پون گھنٹے سے پہلے گھر نہیں پہنچ سکتا تھا۔اتنی دیر سردی میں رہنے کی وجہ سے اس لڑکی کا زندہ بچ جانا مشکل دکھائی دیتا تھا۔کیا کرے؟ سوچ میں پڑ گیا۔ اچانک ایک راہ سجھائی دی۔ایک فرلانگ کے فاصلے پر سڑک کے کنارے پوپلے منہ والے گل زیب کا ہوٹل ہوا کرتا تھا۔اسے یقین تھا کہ وہ ہوٹل اب بھی اسی جگہ پر ہوگا۔وہ سیاحوں کو لوٹنے کے لئے بنایا گیا ایک موسمی ہوٹل تھا جو اپریل سے اوائل ستمبر تک چلتا تھا۔یہاں چائے، پکوڑے اور سموسے مہنگے داموں بکا کرتے تھے۔گل زیب موسم کے موسم کماتا اور سارا سال گھر بیٹھ کر کھایا کرتا تھا۔یقیناً اس وقت ہوٹل کو بند ملنا چاہئے تھا جس کی کھوکھا نما چوبی عمارت میں یا پتھروں کی بنی ہوئی ڈیوڑھی میں اس لڑکی کو لے جا کر آگ سینک سکتا تھا۔

اس نے زیادہ سوچ بچار میں وقت ضائع نہیں کیا۔فوراً جھک کر لڑکی کی بغلوں میں ہاتھ ڈالے اور جھٹکے سے اٹھا کر کندھے پر ڈال

لیا۔ وہ اتنی وزنی نہیں تھی مگر اس وقت بھاری بھرکم محسوس ہوئی۔ چند قدم چلا، عادتاً بڑبڑایا، ’’نہیں یار! یہ تو پلی پلائی گائے ہے۔ بہت بھاری ہے۔ نجانے کیا کھاتی رہتی ہے۔‘‘

چند لمحوں میں اس کی سانس پھول گئی۔ اس نے کندھا بدلا اور اپنی رفتار تیز کر دی۔ دل ہی دل میں شکر کیا کہ اسے اس حالت میں چڑھائی نہیں چڑھنا پڑی ورنہ معاملہ چوپٹ ہو جاتا۔ فرلانگ بھر کا فاصلہ طے کرنے میں اسے پسینہ آ گیا۔ اپنے اندازے کے مطابق اس نے سڑک کا دائیں کنارہ لے لیا۔ گہری دھند کی وجہ سے چند فٹ کے آگے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اندازے کے تحت ایک جگہ پر پہنچ کر آہستہ ہو گیا۔ یہیں کہیں اس کھوکھا ہوٹل کا کچا راستہ تھا۔ چند قدم چلنے کے بعد اسے وہ دو اڑھائی فٹ چوڑا راستہ سڑک کے کنارے سے نکل کر جھاڑیوں کے بیچ گم ہوتا دکھائی دے گیا۔ سیاحوں کے موسم میں اس جگہ پر سبز رنگ کا چوبی بورڈ نصب کیا جاتا تھا جس پر سفید پینٹ سے ’’گل زیب ہوٹل‘‘ اور اس کی جملہ غائب و موجود تعریفیں درج ہوتی تھیں۔

کچے ڈھلانی راستے پر پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اسے دوڑنے میں کیل دار جوگرز بھرپور مدد کر رہے تھے۔ وہ پھسلے بغیر چند ہی لمحوں میں اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ اس کے عین سامنے مقفل چوبی کھوکھا، سیاہ پتھروں کا بنا ہوا دو تین فٹ بلند چبوترا اور بائیں ہاتھ پر کھولی نما احاطہ تھا جس میں بڑی مونچھوں والا گل زیب اپنے برتن رکھا کرتا تھا۔ اس نے لڑکی کو چبوترے پر لٹایا اور کھوکھے کو لگے ہوئے تالے کا جائزہ لیا۔ تالا بہت سرد تھا۔ برف کے گولے کی طرح۔ اس نے چبوترے کی نکڑ سے پتھر اٹھایا اور دو چار کاری ضربوں سے تالا توڑ دیا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے کھوکھے کا اگلا حصہ اوپر اٹھا دیا۔ لائٹر ٹارچ کی مدد سے ایک آہنی سلاخ تلاش کرنے میں تھوڑی سی دقت پیش آئی جس کی مدد سے کھوکھے کے اگلے حصے کو چھجے کے مانند اوپر کھڑا کیا جا سکتا تھا۔ چھجا پتھروں کے بنے ہوئے ٹیڑھے میڑھے چبوترے پر بھی سایہ فگن ہو گیا۔ چند ہی لمحوں میں لڑکی کھوکھے کے فرش پر پڑی تھی اور وہ کھوکھے میں موجود میلے چیکٹ کپڑوں کو اس کے اوپر ڈھیر کرنے میں مصروف تھا۔ تینوں دیواروں سے لٹکے ہوئے کئی برتن اور اوزار بھی اس کوشش میں لڑکی پر آن گرے۔ اسے لوہے کی موٹی چادر والا دیسی ساخت کا چولہا بھی مل گیا جس سے وہ فی الوقت انگیٹھی کا کام لیا جا سکتا تھا۔ اس چولہے کو اس نے کھوکھے کے باہر سنگیں چبوترے پر رکھ دیا۔

لڑکی کو قدرے محفوظ کرنے کے بعد وہ چابک دستی سے اس چھ ضرب چھ فٹ کے سالخوردہ کھوکھے سے باہر آیا۔ ادھر ادھر بھاگا۔ کھوکھے کے عقب کی اترائی میں اسے لکڑیوں کا بے ترتیب ڈھیر دکھائی دیا۔ وہ احتیاط سے نیچے اترا۔ لکڑیوں کا جائزہ لیا۔ گیلی تھیں مگر کلہاڑے کی مدد سے چیری گئی تھیں۔ ایسی لکڑیاں تھوڑی سی محنت سے آگ پکڑ لیتی ہیں۔ وہ کوئی پانچ دس کلو لکڑیاں اُٹھائے واپس آیا۔ چبوترے پر پڑے چولہے میں ترتیب سے رکھنے کے بعد لائٹر کی مدد سے آگ جلانے کی کوشش کرنے لگا۔ گیلی اور سرد لکڑیوں کو آگ

نہیں لگی تو اس نے لڑکی پر پڑے ہوئے کپڑوں میں سے ایک بڑا سا ٹکڑا اٹھا لیا۔ اسے شعلہ دکھا کر لکڑیوں میں گھسیڑ دیا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد لکڑیاں جل اٹھیں اور گہرے سیاہ رنگ کا دھواں لکیر کی صورت میں اوپر اٹھ کر دھند میں تحلیل ہونے لگا۔

اس نے اپنے کوٹ کے بٹن کھولے۔ پلو بنا کر پنکھے کی طرح آگ کو جھلا۔ چند ہی منٹوں میں لکڑیاں جل گئیں اور سرخ رنگ کے انگارے بن گئے۔ پھر ادھ جلی لکڑیوں کو چبوترے پر رکھ کر اس نے چولہے کو کھوکھے کے اندر منتقل کیا اور لڑکی کے چہرے کے پاس آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ قدرے تنگ جگہ پر بیٹھنا مشکل تھا۔ اسے قدرے اطمینان ہوا جب اسے لڑکی کی سانسیں محسوس ہونے لگیں۔ وہ زندگی کی طرف لوٹ رہی تھی۔ گندے مگر قدرے گرم کپڑوں کی حدت نے کام دکھا دیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں لڑکی کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا اور نیلگوں عکس ختم ہونے لگا۔ اس نے دو تین مرتبہ لڑکی کو پکارا۔ چپتیں رسید کیں۔ ہلایا جلایا۔ پھر دل کی دھڑکن چیک کی۔ نبض محسوس کی۔ یقین ہو گیا کہ وہ خطرے سے باہر آ گئی تھی اور کسی بھی وقت ہوش میں آ سکتی تھی۔

اس نے مطمئن ہو کر لائٹر ٹارچ آف کر دی۔ اندھیرے نے لڑکی کا چہرہ چھپا دیا۔ چونکہ کھوکھے کی درزیں موٹے ردی کاغذوں سے بند کی گئیں تھیں، اس لیے تیز سرد ہوا کھوکھے میں داخل نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے چوبی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی اور لڑکی کے متوازی ٹانگیں پھیلا دیں۔ سگریٹ سلگائی اور سوچ میں غلطاں ہو گیا۔ لڑکی پہیلی کی صورت اس کی زندگی کی اس رات میں آئی تھی۔ جب تک ہوش میں نہیں آتی تھی، پہیلی بوجھی نہیں جا سکتی تھی۔

پانچ سال پہلے جب وہ آخری بار اسی راستے پر پیدل چل رہا تھا تو دل ہی دل میں فیصلہ کر رہا تھا کہ بقیہ زندگی میں کبھی ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ وہ اپنے بابا اور بڑے بھائی سے ناراض ہو کر گاؤں چھوڑ رہا تھا۔ اسے ماں کے علاوہ گھر میں کسی فرد نے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ماں پر بھی اپنے خاوند کے درشت رویے کا دباؤ تھا ورنہ وہ روکنے پر آتی تو روک ہی لیتی۔ بابا نے اس کے پلو میں یہ الوداعی جملے باندھے تھے، ”تم گھر چھوڑ کر جا رہے ہو۔ تم سے پہلے بھی ان گنت بیٹوں نے اپنے باپ سے ناراض ہو کر گھر چھوڑے ہیں۔ سبھی کو ایک نہ ایک دن لوٹنا پڑا۔ تم بھی لوٹو گے۔ مگر یاد رکھنا...... میرا خون بہت ضدی ہے۔ تمہاری رگوں میں اگر میرا خون دوڑتا ہے تو تمہاری دوڑ کا رخ زندگی بھر آگے کی طرف ہی رہنا چاہیے۔ کبھی تمہارا دھیان پیچھے کی طرف نہیں ہونا چاہیے۔“

اس نے ایک نگاہِ شکایت بابا پر ڈالی۔ منہ سے کچھ نہیں کہا۔ دل میں تہیہ کیا، ”بابا! تمہیں مایوسی نہیں ہو گی۔ میری رگوں میں تمہارا خون ہی دوڑ رہا ہے۔“

پھر وہ پانچ سال تک آگے کی طرف منہ کیے دوڑتا رہا۔ ماں کا چہرہ کسی پل بھولتا تو اسے یاد کرنے کی سعی کرتا۔ بہنیں یاد آتیں تو آنکھیں بھیگ جایا کرتیں مگر وہ خود کو سمجھایا کرتا کہ اسے اپنی رگوں کی کٹوریوں کا مال سچا اور حلال ثابت کرنا ہے۔ بڑھنا ہے، پلٹنا

نہیں..... مگر پھر اس کی اکائی ٹوٹ گئی۔ اس کی رگوں میں فولادی خون انڈیلنے والا بابا ٹوٹ گیا۔ وہ جو کہا کرتا تھا کہ مرد کا ٹوٹنا اور جھکنا ایک ہی عمل کے دو نام ہیں۔ وہ جھک گیا تھا، یعنی ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے نہ جانے کس طرح اس کے فون نمبر کا کھوج نکالا اور سلام دعا یا تمہید کے بغیر کہا، ''تمہارے بابا کو تمہاری ضرورت ہے۔''

بس..... بابا نے خدا حافظ کہنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے بابا کے منہ سے نکلے ہوئے یہ الفاظ کتنے قیمتی تھے اور انہیں ادا کرنے تک کتنا کٹھن سفر اس کے باپ نے طے کیا تھا۔ وہ پانچ سالوں سے ضد پر اڑا ہوا تھا مگر دل کے کان شاید اسی صدا کے منتظر تھے کہ اس نے کراچی چھوڑنے اور گاؤں کا قصد کرنے میں ایک دن بھی ضائع نہیں کیا۔ کراچی میں اس کے پاس سفید رنگ کی کلٹس کار تھی۔ اس پر اتنا طویل سفر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے اس نے بائی ائر اسلام آباد کا قصد کیا۔ راولپنڈی کے ایک شوروم سے پرانے ماڈل کی فور ویل جیپ خریدی۔ ایجنٹ کو ٹوکن منی دے کر اپنی تحویل میں لی اور فوری طور پر گاؤں کا رخ کیا۔ جیپ کی رگوں میں ڈیزل دوڑتا تھا، سردی میں جم گیا۔ اسے چلانے والے کی رگوں میں جذبات سے بھرپور خون دوڑتا تھا جو برف سے لڑنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔

گھر کے قریب پہنچتے ہی گاڑی کی خرابی اور سیاح لڑکی سے مڈبھیڑ جیسی رکاوٹیں حائل ہو گئیں۔ پہلے وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اسے رات کسی ہوٹل میں گزار لینا چاہیے تھی۔ اب سوچ رہا تھا کہ اگر وہ کسی ہوٹل میں رک جاتا یا کسی پرانے شناسا کے گھر چلا جاتا تو اس لڑکی کے زندہ بچ جانے کے چانس زیرو ہو جاتے۔ اس نے رات نہ رکنے کا اچھا فیصلہ کیا تھا۔ شاید قسمت کو اس بدقسمت لڑکی کی یاوری مقصود تھی۔

وہ ابھی اپنے بابا کے بارے سوچ رہا تھا کہ بے ہوش لڑکی ہولے سے کسمسائی۔ وہ چونک گیا۔ اس نے جلدی سے لائٹر ٹارچ روشن کی اور روشنی کا مدھم سا ہالا لڑکی کے چہرے پر پھینکا۔ وہ آنکھیں جھپک رہی تھی۔ وہ آگے جھکا، ''ہے..... آر یو اوکے؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ آنکھیں پھاڑے اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کے روشن نقطے کو گھورتی رہی۔ شاید اپنے ماحول کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے ہلایا جلایا۔ گال پر چپت رسید کی۔ لڑکی نے سر ادھر ادھر ہلایا اور دونوں ہاتھوں کو چوبی فرش پر ٹکا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا چہرہ اتنا قریب آ گیا کہ اس کی بے ترتیب سانسیں اسے چہرے پر محسوس ہونے لگیں۔

وہ پیچھے ہٹنے کی کوشش کرتے ہوئے مستفسر ہوا، ''آئی سے یو سم تھنگ؟''

اس نے آنکھیں جھپکائیں۔ خمار بار آواز میں بولی، ''واٹ..... ہو آر یو؟''

اس نے ایک طویل سانس حلق میں اتاری۔ اندازہ ٹھیک تھا۔ وہ یورپین تھی۔ رواں انگلش میں بول رہی تھی۔ مقامی ہوتی تو اس کا لہجہ اس کا ساتھ نہ دیتا۔ وہ انگریزی میں بولا، ''میں کون ہوں، یہ اہم سوال نہیں ہے۔ تم کون ہو، یہ اہم بات ہے۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ تم اتنی

رات گئے اس ویرانے میں کیا کر رہی تھیں؟“

وہ کچھ نہیں بولی بلکہ اپنی ایڑیاں تختوں میں اٹکا کر پیچھے کھسکی۔ اس کے چہرے پر خوف، سراسیمگی اور تشویش کے اثرات مدغم تھے۔ ایک پریشانی یہ بھی تھی کہ ٹارچ کی روشنی آنکھوں میں چبھ رہی تھی اور وہ اپنے مخاطب کا چہرہ نہیں دیکھ پا رہی تھی۔ اس نے اپنے بدن سے چمٹے کپڑوں کی طرف دیکھا۔ اندھیرے میں ان کے میلے پن کا احساس نہیں ہوا۔ محض حدت کا احساس ہو رہا تھا۔ اردگرد دیکھا۔ جتنا ماحول ٹارچ کی روشنی میں دکھائی دے رہا تھا، اس کا بغور جائزہ لیا۔ ماحول سے...... یا اُس سے ڈر گئی۔ سراسیمگی چہرے پر ثبت ہوگئی۔ بولی، ”میں مرنا نہیں چاہتی...... میں بس یہاں سے نکل جانا چاہتی ہوں۔ مجھے چھوڑ دو۔ جانے دو...... فار گاڈ سیک!“

اس نے اٹھنا چاہا۔ یہاں لانے والے نے بازو سے پکڑ کر آہستگی سے بٹھا دیا۔ کہا، ”میں نے تمہیں مرنے سے بچا لیا ہے۔ اگر تمہیں مارنا میرا مقصد ہوتا تو مجھے کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بس تمہیں سردی میں وہیں پڑا رہنے دیتا، جہاں تم پڑی تھیں۔ ڈرو مت۔ جہاں جانا چاہو گی، وہاں چھوڑ آؤں گا۔“

اس کا ڈر قدرے کم ہوا۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی، ”میں کہاں ہوں؟“

وہ مسکرایا، ”مجھے اسی سوال کی توقع تھی۔ بے ہوشی سے ہوش میں لایا جانے والا ہر شخص یہی سوال کرتا ہے۔ خیر...... بتا دیتا ہوں۔ میں نے تمہیں سڑک کے کنارے نصب پتھر سے چھپکلی کی مانند چمٹے دیکھا تو اٹھا کر یہاں لے آیا۔ یہ چلغوزے کی لکڑی کا بنا ہوا کمرہ ہے۔ اسے ایک دکان کہہ سکتی ہو۔ گرمیوں کے موسم میں ہوٹل کا کام دیتا ہے۔ سردیوں میں بند پڑا رہتا ہے۔ شاید پہلی مرتبہ آف سیزن کھلا ہے۔ میں نے تالا توڑ کر تمہیں اس میں ڈالا ہے تاکہ تم سردی سے بچ جاؤ۔“

اس کے ہونٹ دائرے کی صورت میں پھیل گئے۔ 'اوہ' کی مدھم سی آواز ابھری۔ چند لمحے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر بولی، ”آئی وانٹ ٹو سی یو...... پش اسائیڈ اٹ پلیز!“

اس کا اشارہ ٹارچ کی طرف تھا۔ اس نے ٹارچ ہٹا کر روشنی اپنے چہرے پر پھینکی۔ بولا ”لو...... دیکھ لو......“

وہ چند لمحے حیرانی سے دیکھتی رہی۔ پھر بولی، ”مگر میں تمہیں نہیں جانتی۔ تم کون ہو؟“

”میرا نام احمد ہے۔ ادھر، نیچے کی طرف، جدھر سے تم آئی ہو، ایک گاؤں ہے...... سندر بن...... میں وہاں کا رہنے والا ہوں مگر اس وقت کراچی سے آ رہا ہوں۔ راستے میں میری گاڑی خراب ہوگئی تھی۔ پیدل چلا آ رہا تھا کہ تم سڑک کے کنارے بندر کی طرح لٹکتی ہوئی نظر آ گئیں۔“

اس کی انگریزی رواں اور شستہ نہیں تھی۔ کبھی بے لاگ بولنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ چونکہ بچپن سیاحوں سے ملنے جلنے میں گزرا تھا،

ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنا از خود سیکھ گیا تھا، اس لیے اپنا مدعا بیان کرنے اور اس لڑکی کی بات سمجھنے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ بولا ”اب تم بتاؤ، تم کون ہو؟“

وہ شاید ابھی مکمل حد تک ہوش مند نہیں تھی۔ اسے ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ اپنے بدن کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بولی، ”کیا تم اُردو زبان بول سکتے ہو؟“

وہ چونکا۔ پوچھنے والی نے انگریزی کے بجائے اُردو میں سوال کیا تھا۔ اس کے لہجے سے یورپین تاثر یک لخت معدوم ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اسی ملک کی رہنے والی ہو۔ بولا ”ہاں...... مگر تمہیں اُردو آتی ہے؟ حیرانی کی بات ہے۔“

عمومی طور پر سیاح جب تین چار ماہ سے زیادہ عرصہ اس علاقے میں رہتے تھے تو انہیں ٹوٹی پھوٹی اُردو بولنا آ جاتی تھی مگر اتنی روانی انہیں میسر نہیں آتی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی، ”میرا نام سنبل ہے۔“

احمد کے گویا ذہن میں کوئی برق بلا کوند گئی ہو۔ حیرانی سے بولا، ”تو کیا تم پاکستانی ہو؟“

”ہاں! مگر اس میں اتنی حیرانی کی کیا بات ہے؟“ لڑکی گھبرا سی گئی۔

احمد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی کلائی تھام کر نبض ٹٹولنے لگا۔ چند لمحوں بعد بولا ”تمہارا ٹمپریچر بڑھ رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہیں بخار ہونے والا ہے۔“

سنبل نے آنکھیں بند کر لیں۔ منہ سے کچھ نہیں کہا۔ احمد نے چولہے کی راکھ کو کریدا۔ چند ننھے انگارے دکھائی دیے جو اس غضب کی سردی کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اُٹھا اور لکڑیاں اُٹھا لایا۔ چولہے میں ڈال کر پھونکیں مارنے لگا۔ آگ بھڑک گئی تو بولا ”تم لاہور سے آئی ہو؟“

”نہیں...... میں سنڈرلینڈ سے آئی ہوں۔ کیا تم نے یہ نام سن رکھا ہے؟“ احمد کے شستہ لہجے نے سنبل کے خوف کو خاصا کم کر دیا تھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ بولا، ”انگلینڈ کا شہر ہے...... یا شاید علاقہ ہے...... کیا میں نے درست کہا ہے؟“

اس نے جواب نہیں دیا بلکہ کھوکھے کے باہر دیکھنے لگی، ”سنڈرلینڈ میں بہت سردی ہوتی ہے مگر نہیں...... یہاں اُس سے کہیں زیادہ سردی ہے۔ جب میں اترائی کے جنگل میں تھی تو یوں محسوس ہوا جیسے میری رگوں میں خون جم گیا ہو...... آہ میرے خدا! میں زندہ ہوں...... مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا۔ جب میں سڑک پر چڑھنے جا رہی تھی تو مجھے یوں لگا جیسے میرا دل پتھر کا ہو گیا ہو اور پھر کیا ہوا؟...... مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔ تم نے مجھ پر بہت احسان کیا کہ یہاں لے آئے ورنہ میں یقینی طور پر اب تک مر گئی ہوتی۔“

وہ مسکرایا، ”کیا تم عام حالات میں بھی اتنی ہی باتونی ہو؟“

وہ خاموش ہوگئی۔ احمد نے اس کے چہرے پر روشنی پھینکی۔ اسپاٹ چہرے پر کچھ بھی تحریر نہیں تھا۔ وہ کیا سوچ رہی تھی، ڈر رہی تھی یا نہیں، کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ اس نے اپنی قمیص کی جیب سے ایک بٹر ٹافی نکالی اور ریپر اتار کر اس کی طرف بڑھائی، ''ٹافی منہ میں رکھ لو، کچھ توانائی مل جائے گی۔''

اس نے بلاتردد ٹافی منہ میں رکھ لی۔ شاید اس کے بازو دُکھ رہے تھے کہ اس نے دونوں ہاتھ اپنے بازوؤں پر رکھ چھوڑے تھے۔

احمد اس سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا تھا مگر سمجھ رہا تھا کہ اسے سنبھلنے کے لئے کچھ وقت درکار ہے۔ تبھی سگریٹ سلگا کر، سر کھوکھے کی دیوار سے ٹکا کر نیم دراز ہوگیا۔ اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ سنبل کے برعکس اس کے دل میں کوئی ڈر نہیں تھا۔ یہ علاقہ اس کا اپنا تھا۔ یہاں کے ایک ایک پتھر سے اس کے بچپن کا یارانہ تھا۔

سگریٹ کا دھواں سنبل کو ناگوار لگا۔ بولی، ''تم یہ سگریٹ بجھا نہیں سکتے؟''

''یقیناً میں اسے بجھا سکتا ہوں مگر بجھانا نہیں چاہتا۔ تمہیں اگر اس کا دھواں اچھا نہیں لگتا تو تم کروٹ بدل کر اپنا منہ دوسری طرف کر لو۔''

''اوہ سوری...... تمہیں میری بات بری لگی۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

وہ زیرِ لب مسکرایا اور لمبے لمبے کش لینے لگا۔ ایسے ہی وقت میں چبوترے کی دوسری طرف اسے سیاہ ہیولا دکھائی دیا۔ اس نے ٹارچ کا رخ اس طرف کیا۔ ہیولا واضح ہونے کے بجائے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ وہ ایک دم اُٹھ بیٹھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، چبوترے کی اوٹ میں ہوگیا تھا۔ اس کی چھٹی حس نے خبردار کیا کہ ہیولا کسی انسان کا تھا، جانور کا نہیں تھا اور وہ یقینی طور پر چبوترے کے پیچھے ارادی طور پر چھپا تھا۔ وہ تحکمانہ انداز میں دھاڑا، ''اوئے! کون ہو تم؟ سامنے آؤ.....''

چند ہی لمحوں بعد چبوترے کے پار ہیولا نمودار ہوا۔ ٹارچ کی دھندلی روشنی میں اس کا بالائی دھڑ دکھائی دیا۔ وہ کوئی جسیم مرد تھا اور روزنی کوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے خال وخط دکھائی نہیں دے رہے تھے مگر اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کاربین ٹارچ کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ احمد کے دماغ میں سوولٹ کا بلب روشن ہوگیا۔ آنے والا جو کوئی بھی تھا، اچھے ارادے سے ادھر نہیں آیا تھا۔ چونکہ اس علاقے میں چوری ڈکیتی کی وارداتیں نہیں ہوا کرتی تھیں اور خاص طور پر رات کو اس طرف کسی کے آنے کا ایک فیصد امکان بھی نہیں تھا، اس لیے لامحالہ طور پر وہ لڑکی کو تلاش کرتا ہوا اِدھر آیا تھا۔

احمد نے کھوکھے سے اترنے میں ثانیہ بھر کا وقت لیا مگر چبوترے کے پار کھڑے جسیم شخص نے نہ صرف اس پر کاربین تان لی بلکہ غرا کر دھمکی بھی دے دی، ''خبردار! جہاں ہو، وہیں رک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔''

وہ رک گیا۔اس کے عقب میں سنبل کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری، ''خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو۔میں زندگی میں کبھی بھی ادھر نہیں آؤں گی......فارگاڈ سیک! مجھے جانے دو......''

احمد نے پلٹے بغیر ڈانٹا، ''خاموش رہو۔'' پھر مقابل شخص سے مخاطب ہوا، ''گن نیچے کرو۔تم کون ہو اور وادی میں کیا کر رہے ہو؟''

''بکومت......ایک طرف ہٹ جاؤ، اگر زندگی چاہتے ہوتو......میں اس لڑکی کو تلاش کرتا ہوا ادھر آیا ہوں۔مجھے کیا خبر تھی کہ اس حرافہ نے اپنا کوئی یار بھی ادھر بلا رکھا ہے۔''

احمد سنبل اور حملہ آور کے درمیان تن کر کھڑا تھا۔غرایا، ''اوئے الو کے پٹھے......تم مجھے نہیں جانتے ہو۔میں......''

''تم کون ہو، مجھے اس سے غرض نہیں ہے۔'' اس نے خونخوار انداز میں اس کی بات کاٹی، کاربین کی نال سے ایک طرف ہٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا، ''ہری اپ......''

احمد نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تولا۔وہ اس سے زیادہ قدآور اور جان مند تھا۔خوف ناک کاربین کا ایڈوانٹیج بھی اُسے حاصل تھا۔ایسے میں اس پر غلبہ پانا مشکل تھا۔اس کے تضحیک آمیز اشارے پر ایک طرف ہٹنا اور سنبل کو اس کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا بھی مردانگی کے خلاف تھا۔سرد لہجے میں بولا، ''تم اس علاقے کے نہیں لگتے۔کہاں سے آئے ہو؟''

''بکواس نہ کرو۔جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو ورنہ......'' اس نے اپنی دھمکی کو خطرناک بنانے کے لئے کاربین پر ہاتھ کا دباؤ بڑھایا۔

ایسے ہی وقت جب احمد گومگو کی کیفیت میں کھڑا تھا، سنبل کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی، ''احمد......ایک طرف ہٹ جاؤ......مجھے مرنے دو۔میں ان لوگوں کے لئے مصیبت بن گئی ہوں۔اچھا ہے، مر جاؤں۔''

اس کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔اس نے سرِ دست پسپائی اختیار کرنے کی حکمتِ عملی اپنائی اور ایک طرف ہٹ گیا۔میدان صاف ہو گیا تو حملہ آور نے اپنی پوزیشن بدل لی۔اس کے عین مقابل آ گیا۔اب اسے ایک ہی وقت میں دونوں کو اپنے نشانے پر رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔بولا، ''اے حرام زادی! کھوکھے سے باہر نکل آ......اِدھر......اِس طرف!''

احمد نے جلدی سے کہا، ''وہ اٹھ نہیں سکتی۔تیز بخار میں پڑی ہے۔''

حملہ آور نے ایک ہنکارا ابھرا۔اور چبوترے کا چکر کاٹ کر کھوکھے کے شیڈ تلے آ گیا۔احمد اس پر آنکھیں ثبت کیے اپنی حکمتِ عملی تیار کر رہا تھا۔اسے یہ محسوس ہو گیا تھا سنبل کے تعاقب میں آنے والا شخص اسے گولی مارنے کے حق میں نہیں تھا ورنہ اسے سنبل کو کھوکھے سے باہر بلانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔وہ اسے زندہ حالت میں لے جانے کے لئے آیا تھا۔

اچانک حملہ آور نے غیر متوقع حرکت کرتے ہوئے ہاتھ بڑھایا اور سنبل کا بازو پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔جونہی وہ کھوکھے کے بڑھتے ہوئے

تختے سے پھسل کر زمین پر گری، احمد نے بجلی کی سی مستعدی سے چھلانگ لگائی اور کاربین بردار کو اپنے ساتھ لیتا ہوا ڈھلان میں جا گرا۔ اس کے ہاتھ سے لائٹر گر گیا۔ کاربین بردار کے منہ سے مغلظات کا طوفان ابل پڑا۔ نیچے گرتے ہی اس نے احمد کو زوردار دھکا دے کر اپنے اوپر سے گرا دیا۔ وہ ڈھلان پر لڑھکا مگر چند قدموں کے فاصلے پر سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس دوران اس کا مقابل بھی اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی تنی ہوئی کاربین کا رخ احمد کی طرف تھا۔

''تیری تو......'' اس نے دانت کچکچائے اور ٹرائیگر دبا دیا۔ احمد کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا مگر زوردار دھماکے کے ساتھ کاربین کی نال سے نکلنے والی گولی اس کے لانگ کوٹ کو چھوتی ہوئی عقب میں واقع گہری کھائی میں گم ہو گئی۔ احمد پر جنوں طاری ہو گیا اور اس نے گن بردار کو بولٹ چڑھانے اور دوسری گولی داغنے کا موقع نہ دیتے ہوئے قدم بڑھایا۔ جھک کر اس کی دونوں پنڈلیاں پکڑیں اور بجلی کی سی تیزی سے اپنی جانب کھینچ لیں۔ اس کی پتھریلی زمین پر تشریف آوری خاصی تکلیف دہ تھی۔ ساتھ ہی احمد چھلانگ لگا کر اس پر چڑھ گیا۔ اس نے پہلی ساعت میں ہی کاربین والی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔ گولی چلی مگر اس کا رخ کہر بھرے آسمان کی طرف تھا۔ فائر کی دل دہلا دینے والی آواز وادی میں اپنی ڈراؤنی بازگشت چھوڑ گئی۔

گن بردار نے کلائی چھڑانا چاہی۔ منہ پر احمد کا زوردار مکا لگا۔ اوسان خطا ہو گئے۔ اس کے حلق سے 'اوغ' کی آواز برآمد ہوئی۔ احمد کے نیچے سے نکلنے کی کوشش مہنگی پڑی کیونکہ احمد نے اپنی کہنی پوری قوت سے اس کی پسلیوں میں دے ماری تھی۔ اگر اس نے گرم کوٹ نہ پہن رکھا ہوتا تو ایک دو پسلیوں کا ٹوٹ جانا یقینی تھا۔ وہ نیچے سے غرایا ''میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا......''

یوں لگتا تھا جیسے وہ انسان نہیں، گالیاں دینے کی مشین تھا۔ اس نے ایک ہی سانس میں کئی گالیاں دے ڈالیں۔ ایسے ہی وقت میں اس کے سر پر زوردار آواز کے ساتھ پتھر لگا۔ وہ دردناک انداز میں چیخا۔ احمد نے اوپر دیکھا۔ سر کو دائیں بائیں جھٹکتے ہوئے جسیم شخص کے سر پر سنبل کھڑی تھی۔ اسی نے پتھر مارا تھا۔ اب وہ دوسرے پتھر کی تلاش میں تھی۔ آنِ واحد میں اس کے ہاتھ میں دوسرا پتھر آ گیا۔ اس نے پوری قوت سے وہ بھی حملہ آور کے سر پر دے مارا جس کے نتیجے میں اس نے ایک ڈراؤنی آواز نکال کر اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ احمد نے اس کی کلائی کو مروڑا۔ کاربین ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ یقینی طور پر بے ہوش ہو گیا۔

احمد نے سنبل کو کاربین اٹھانے کا اشارہ کیا۔ وہ کاربین کی طرف بڑھی مگر بہت کم جگہ ہونے کی وجہ سے کاربین کی طرف نہ بڑھ پائی اور لاچارگی کے عالم میں رک گئی۔ احمد نے اس کی مجبوری بھانپ لی۔ ایک زوردار گھٹنا اپنے تلے دبے ہوئے لحیم شحیم شخص کی ٹانگوں کے بیچ مارا اور کوئی ردِعمل نہ دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ دایاں پاؤں ایک ابھرے ہوئے پتھر پر ٹکا کر کھڑا ہوا اور جسم کو جھکا کر کاربین اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی سی بے احتیاطی کے سبب وہ اپنا توازن کھو سکتا تھا۔ کاربین ہاتھ سے لگی تو کھسک گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے

ڈھلان میں لڑھک کر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

اس نے سنبل سے کہا، ”وہ...... لائٹر اٹھالاؤ۔“

وہ پلٹی اور چبوترے کے پاس پڑے ہوئے لائٹر کو اٹھالائی۔ بے ہوش پڑے جغادری پر روشنی ڈالتے ہی چلا اٹھی، ”اوہ...... یہ تو پربت شاہ کا کتا ہے...... اِسے مارڈالو۔ اس نے مجھے بہت مارا تھا۔ نہیں...... تم نہیں...... میں خود اس کا سر مسلوں گی......“

اس پر عجیب سی جنونی کیفیت طاری ہوگئی اور احمد کے روکنے اور ڈانٹنے کے باوجود اس نے ایک پتھر اٹھالیا اور ہذیانی کیفیت میں چیختے ہوئے اس کے سر پر پے در پے وار کرنا شروع کر دیے۔ دو چار ضربوں کے بعد چاروں شانے چت پڑے سورمے کا بدن ایک ذرا دیر تڑپتا رہا پھر ساکت ہوگیا۔ سنبل پوری قوت سے ڈیڑھ دو کلو بھاری نوکیلا پتھر اس کی کھوپڑی میں مار رہی تھی۔ جونہی احمد کو اندازہ ہوا کہ وہ جان کی بازی ہار چکا ہے، اس نے کہا، ”نہیں سنبل...... اب اور نہ مارو اِسے۔ یہ مر چکا ہے۔“

سنبل کے مشین کی طرح چلتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ احمد نے دونوں پیروں کے بیچ پڑے ہوئے شخص کا بدن ٹٹولا، نبض دیکھی اور ہاتھ جھاڑ کر سنبل کی طرف بڑھ گیا۔ ایسے ہی وقت میں اس کے کانوں میں دوڑتے قدموں کی دھمک پڑی۔ وہ سنبل کے سامنے پہنچ کر ٹھٹک گیا۔ کان لگائے۔ اترائی کی جانب سے کوئی سڑک پر دوڑا چلا آرہا تھا۔ وہ یہ اندازہ نہ کرسکا کہ آنے والا ایک تھا یا ایک سے زیادہ افراد ادھر آرہے تھے۔ بڑبڑایا، ”فائرنگ کی آواز سن کر شاید اس کتے کے ساتھی آرہے ہیں۔“

سنبل کی جذباتی کیفیت تھم گئی تھی۔ سہمے سہمے انداز میں احمد کو دیکھنے لگی۔ احمد نے اس کے ہاتھ سے لائٹر لیا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھوکھے کی عقبی سمت دھکیلتے ہوئے بولا، ”ہمیں اس طرف جانا ہوگا۔ یہ جگہ اب محفوظ نہیں رہی۔“

وہ بمشکل گرنے سے بچی۔ سنبھل کر کھوکھے کے پہلو سے اترائی کی جانب بڑھی۔ احمد اس کے عقب میں تھا۔ اسے سنبل کی برہنہ پائی کا احساس ہوا، بولا، ”کیا تم نے جوتے نہیں پہنے ہوئے؟“

وہ رک کر بولی، ”نہیں......“

اسے کمر پر ہاتھ رکھ کر دھکیلتے ہوئے نہایت مدھم آواز میں بولا، ”نہیں یار...... رُکنا نہیں......“

وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ احمد کو جلد ہی احساس ہوگیا کہ وہ ان راستوں پر تیز چلنے کی عادی نہیں تھی۔ گرسکتی تھی۔ اس نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر روکا اور پہلو سے نکل کر آگے آگیا۔ بولا، ”تم میرے پیچھے پیچھے چلو۔ گروگی تو میں سنبھال لوں گا۔ ہری اپ!“

قدموں کی چاپ قریب آگئی تھی اور اب عین سر کے اوپر سنائی دے رہی تھی۔ وہ سڑک سے دس پندرہ فٹ نیچے چلتے ہوئے مسلسل سڑک سے دور ہو رہے تھے۔ ایک باہر کو نکلی ہوئی نوکیلی چٹان کے تقریباً نیچے سے جھک کر گزرتے ہوئے احمد نے رک کر سڑک کی طرف

کان لگائے۔اب ان کے بولنے کی آوازیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح سنائی دے رہی تھیں اور وہ یقیناً دو یا دو سے زیادہ لوگ تھے جو کھوکھے والے راستے پر اترے بغیر چڑھائی کی جانب عازمِ سفر تھے۔انہیں فائرنگ سنائی دی تھی مگر وہ فائرنگ کی لوکیشن کا صحیح اندازہ نہیں کر سکے تھے اس لیے آگے بڑھ گئے تھے۔

اترائی میں جانے کے لئے باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔درختوں کے تنے یا شاخیں تھام کر نیچے اترنا پڑ رہا تھا جو بہت کٹھن کام تھا۔پائن کے صدیوں پرانے درختوں کی زمین سے نکلی ہوئی جڑوں نے راستے کو بے حد دشوار گزار کر دیا تھا۔احمد کو قدم قدم پر ٹھوکریں لگ رہی تھیں اور اسے نہ صرف خود کو سنبھالنا پڑ رہا تھا بلکہ گاہے بگاہے سنبل کو بھی تھامنا پڑتا تھا۔

انتہائی گھنی جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی ایک کھائی میں پہنچ کر احمد رک گیا۔سرگوشی کے انداز میں بولا،''یہ جگہ محفوظ ہے۔یہاں تک پہنچنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔خاص طور پر اس اندھیرے اور سردی میں......''

سنبل کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ایک لمبی جڑ کا سہارا لے کر گیلی زمین پر بیٹھ گئی۔بولی،''یہاں سردی بھی نسبتاً کم ہے۔''

احمد نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں کو معتدل کیا۔ٹارچ لائٹر کی مدد سے بیٹھنے کی جگہ تلاش کی۔بیٹھ گیا اور لائٹر آف کر کے بولا،''میرا خیال ہے کہ اس اُلو کے پٹھے نے ہماری آوازیں سن لی تھیں ورنہ ہم تک کبھی نہ پہنچ پاتا۔''

''یعنی ہم وہی غلطی دوبارہ کر رہے ہیں؟''سنبل نے دانستہ اپنی آواز بہت دھیمی رکھی۔

احمد کے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔سنبل کی بات دل کو لگی تھی۔کافی دیر تک دونوں خاموش بیٹھے سرسراتی ہوا کے شور سے قدموں کی آہٹ یا انسانی آوازیں کھوجتے رہے مگر ناکام رہے۔

دس منٹ ایسے ہی گزر گئے۔سنبل نے چہرہ نزدیک کیا،''احمد......مجھے سردی لگ رہی ہے۔''

''اس موسم میں کسی کو بھی گرمی نہیں لگ سکتی۔''

''اُفوہ......میرا مطلب ہے کہ مجھے پہلے سے زیادہ سردی لگ رہی ہے۔میرا خیال ہے کہ مجھے واقعی بخار ہو رہا ہے۔''وہ شرمندہ سی ہو کر بولی۔

''ایک جرسی دے سکتا ہوں۔ابھی لو۔''احمد نے اپنی کمر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔شولڈر بیگ کو جھولی میں کھینچنا چاہا مگر ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔اس کا بیگ کھوکھے میں رہ گیا تھا۔

مایوسی سے بولا،''میرے شولڈر بیگ میں ایک اونی جرسی تھی۔وہ کھوکھے میں رہ گیا ہے۔تم ادھر رکو، میں اپنا بیگ اٹھا لاؤں۔''

اس نے اٹھنا چاہا مگر سنبل نے لپک کر دونوں ہاتھ پکڑ لیے،''نہیں پلیز......تم کہیں نہیں جاؤ گے۔''

’’ڈرتی ہو؟‘‘اس نے ہاتھ چھڑانا چاہے۔

’’ہاں...... یہاں تو بہت گہرا اندھیرا ہے۔‘‘

’’اندھیرا انسان کو پناہ میں لیتا ہے۔روشنی سامنے لاتی ہے۔‘‘اس نے دلاسا دیا۔

’’نہیں ناں...... میں نے سنا ہے کہ ان جنگلوں میں لیوپرڈز بھی ہوتے ہیں۔وہ انسان کو چیر پھاڑ دیتے ہیں۔‘‘ وہ روہانسی ہوگئی۔

’’کیا ان چیتوں سے ملنے کے لئے رات کو باہر نکلی تھیں؟‘‘

’’طنز نہ کرو پلیز...... میں بہت برے حالات میں ہوں۔ان لوگوں نے مجھے قید میں رکھا ہوا تھا۔مجھے انہوں نے مارا بھی تھا اور......‘‘

’’کن لوگوں نے؟‘‘ وہ یکبارگی چونکا۔اس لڑکی کی کہانی تو ابھی اس نے سنی ہی نہیں تھی۔بولا،’’تم نے کہا تھا کہ تمہیں واپس لے جانے والا پربت شاہ کا آدمی تھا۔پربت شاہ نے تمہیں قید میں رکھا ہوا تھا؟‘‘

’’ہاں...... وہ بہت کمینہ شخص ہے۔اس کے ساتھ ایک اور بھی کمینہ رہتا ہے۔سردار خان۔مجھے پربت شاہ نے ایک چھوٹے سے مکان میں قید کیا تھا۔ایک گندی شکل والا بھیڑیا وہاں پہرے دار تھا۔مجھے روٹی پانی دیتا تھا۔اس نے پربت شاہ کے حکم پر مجھے مارا بھی تھا۔یہ چھوٹی بندوق والا ایک مرتبہ وہاں آیا تھا،مجھے روٹی دینے۔‘‘سنبل کی آواز بھرا گئی۔اسے بہرحال خود پر اتنا اختیار تھا کہ اس نے اپنی آواز کو بلند نہیں ہونے دیا تھا۔

’’تمہیں ان لوگوں نے کہاں سے اغوا کیا تھا؟‘‘احمد نے استفسار کیا۔

’’نہیں......اغوا نہیں کیا تھا۔میں خود چل کر پربت شاہ کی حویلی میں گئی تھی۔‘‘

’’حیران کن......اب یہ بھی بتا دو کہ تم ان کے پاس کیا لینے گئی تھیں؟‘‘احمد کی حیرانی دیدنی تھی۔

’’اوہ......تم نہیں جانتے ناں......اس لیے حیران ہو رہے ہو۔کیا اب میں تمہیں پوری اسٹوری سناؤں؟‘‘ وہ ایک دم سنبھل کر بولی۔

’’سٹوری تو میں سنوں گا ہی......مگر یہ وقت موزوں نہیں ہے۔اس وقت تمہیں سردی سے بچانا ہے۔کیا کروں؟ کھوکھے کی طرف تم نہیں جانے دیتیں اور ادھر ایسی کوئی شئے ہے نہیں جو میں تم پر اوڑھا دوں۔کھوکھے میں کباڑ کپڑا کافی تعداد میں تھا جو میں نے تم پر ڈال دیا تھا۔اب کیا ڈالوں؟‘‘

احمد کی آدھی سے زیادہ بات نے خود کلامی کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔کچھ نہ سوجھا تو اپنا لانگ کوٹ اتارنے لگا۔بٹن کھولے۔زپ کھولی تو اس کے کھلنے کی آواز سن کر سنبل چونکی،’’کیا تم اپنا کوٹ اتار رہے ہو؟نہیں احمد......اب میں اتنی بھی خود غرض نہیں ہوں۔تمہیں سردی لگ گئی تو میری رہی سہی امید دم توڑ جائے گی۔‘‘

''کیا مطلب؟تم نے مجھ سے کیا امید وابستہ کرلی ہے؟'' وہ استعجاب سے بولا۔

''یہی کہ تم مجھے اس موت کی وادی سے زندہ سلامت نکال کر مہذب دنیا میں پہنچا دو گے۔ یہ وادی درندوں کی ہے۔ یہاں کوئی انسان نہیں رہتا اور سوائے تمہارے مجھے یہاں سے کوئی نکال نہیں سکتا۔ پتہ ہے...... میں تین چار گھنٹوں سے ادھر ادھر چکرا رہی ہوں۔ کس طرف جانا ہے، کس طرف نہیں جانا ہے، مجھے پتہ نہیں چلا۔''

وہ بڑی روانی سے اردو بول رہی تھی مگر کوئی نہ کوئی جملہ مقامی یا انگریزی زبان میں بول جاتی تھی۔احمد نے کہا،'' خدا کرے کہ میں تمہاری توقع پر پورا اتروں۔ابھی رات ہے۔ بہت پرابلم ہے۔ دن چڑھنے پر کچھ اچھا ہو جانے کی توقع کی جا سکتی ہے۔''

ایسے ہی وقت میں اوپر سے ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ دونوں چونک گئے۔ احمد نے سانس روک لی اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔شاید انہیں تلاش کرنے والے کھوکھے تک آن پہنچے تھے۔ احمد نے اوپر دیکھا۔ درختوں کے اوپر کہیں چکراتی ہوئی روشنی کا گماں ہو رہا تھا۔ گویا انہیں تلاش کرنے کا عمل تیزی پکڑ رہا تھا۔ احمد بزدل نہیں تھا مگر صورت حال اسے پریشان کر رہی تھی۔ اگر موبائل فون کام کر رہا ہوتا تو وہ اپنے بابا کو فون کر کے مدد لے سکتا تھا۔ ایک متلاشی قتل ہو چکا تھا۔ دوسرے تلاش کار اس کی لاش تک پہنچ چکے تھے۔ اب ان کا زخمی سانپ کی طرح پھنکارنا اور وادی کا چپا چپا چھان مارنا یقینی تھا۔ وہ اپنے ساتھی کی طرح یقیناً اسلحے سے لیس ہوں گے اور اس وادی کی لاقانونیت انہیں بے دریغ ٹرائیگر دبانے کی اجازت دیتی تھی۔

ایسے ہی وقت اسے سنبل کے بدن میں کپکپاہٹ کا احساس ہوا۔ وہ سردی یا خوف کے مارے کانپ رہی تھی۔ اس نے ہولے سے پوچھا،'' سردی لگ رہی ہے یا ڈر رہی ہو؟''

''دونوں ہی...... کیا میں تم سے چمٹ کر بیٹھ جاؤں؟''

احمد جواب دینے کے بجائے اس کے قریب کھسک گیا۔ وہ خاموش اجازت کو بھانپ کر اس سے چپک گئی۔ اس کے کوٹ کی حدت سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔

''شیورنگ زیادہ ہو رہی ہے۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔''

وہ اور قریب ہو گئی،'' یہی تو کر رہی ہوں۔''

احمد نے ٹٹول کر اس کی کلائی تھامی۔ ٹمپریچر زیادہ تھا۔ یہی حالت رہتی تو بہت جلد اس کا بدن تپنے والا تھا۔ احمد کا ذہن بڑی تیزی سے اس صورتِ حال سے نبٹنے کی راہ تلاش کر رہا تھا مگر کوئی ترکیب سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ ایسے میں کھوکھے کی جانب سے ایک تیز چیختی ہوئی آواز سنائی دی،'' اے...... تم جہاں بھی ہو، سامنے آ جاؤ ورنہ بے موت ماری جاؤ گی۔''

وہ سہم گئی۔سردی نے اسے احمد کے نزدیک کیا تھا۔خوف نے اور قریب کر دیا۔

احمد نے اس کا ہاتھ دبایا،سرگوشی کی،''ڈرو مت۔وہ دیکھے بغیر دھمکی دے رہا ہے۔مجھے یقین ہے کہ وہ اس طرف نہیں آئے گا۔''

سنبل نے ہولے سے سر ہلایا۔اپنے کپکپاتے ہاتھوں کو اس کے کوٹ کی بڑی جیب میں ڈال دیا۔ایسا کرنے سے اس کا آدھا بدن احمد کی گود میں بھر گیا۔احمد کو اس سے بے پناہ ہمدردی کا احساس ہوا۔وہ سہمے ہوئے بچے کی طرح اس کی گود میں اپنا چہرہ چھپا رہی تھی۔گویا خطرے سے نجات حاصل کر رہی تھی۔

احمد کا یقین دیرپا ثابت نہیں ہوا کیونکہ اسے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔کوئی اس طرف اتر رہا تھا جس طرف وہ دونوں چھپے ہوئے تھے۔اس نے سنبل کے کان سے منہ لگایا،''بولنا مت،وہ اس طرف آ رہا ہے۔''

دو تین منٹ میں قدموں کی دھمک عین سر کے اوپر محسوس ہوئی۔ایسے ہی وقت میں درختوں کے بیچ روشنی کا گولا تھرکا۔آنے والا ان کے تعاقب میں آنے کے بجائے اوپر جا نکلا تھا۔

احمد اور سنبل نے سانسیں روک رکھی تھیں۔دونوں کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے۔انہیں دیکھ لیے جانے پر اپنے انجام کی خبر تھی۔احمد نے خود پر چلائی جانے والی گولی کو پوری سنگینی سے محسوس کیا تھا۔وہ جانتا تھا کہ معمولی سی غلطی انہیں زندگی سے دور کر سکتی ہے۔سنبل نے بتایا تھا کہ یہ پربت شاہ کے کارندے تھے۔وہ ان کو نہیں جانتا تھا۔لامحالہ بات ہے کہ وہ بھی احمد سے ناشناسا ہوں گے۔پانچ سال پہلے وادی کے حالات ایسے بالکل نہیں تھے اور یہاں کوئی بھی اجنبی رہائش پذیر نہیں تھا۔سنبل کے پتھروں سے مرنے والا شخص احمد کیلئے اجنبی تھا۔وہ کہاں سے آیا تھا،پربت شاہ نے اسے کیوں رکھا تھا،اسے اندازہ نہیں تھا۔

درختوں کے بیچ چکراتا ہوا بیم لائٹ کا ہالہ ان کے اطراف کی زمین تک پہنچا۔چونکہ لائٹ کے پیچھے دیکھنے والا اوپر کھڑا تھا،اس لیے گہری دھند میں جھاڑیوں تلے چھپے ہوؤں کو نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ایسے میں اس نے چیخ کر کہا،''اے لڑکی!میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔فوراً باہر نکل آؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔''

سنبل کے جسم کو جھٹکا سا لگا۔احمد نے فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کان میں کہا،''احمق ہو کیا؟وہ جھوٹ بول رہا ہے۔اس نے تمہیں دیکھ لیا ہوتا تو دھمکانے کے بجائے یہاں پہنچ چکا ہوتا۔''

سنبل ساکت ہو گئی۔بات سمجھ میں آ گئی۔ایسے میں فضا فائر کی تیز آواز سے گونج اٹھی۔گولی جس جھاڑی کو لگی تھی،وہ ان سے دس بارہ فٹ کے فاصلے پر تھی۔اس نے یکے بعد دیگرے تین گولیاں چلائیں۔تینوں گولیوں کا ٹارگٹ مختلف تھا۔وہ اندھیرے میں تیر چلا رہا تھا۔ایسا کوئی اندھا تیر اُن میں سے کسی کا سینہ بھی چاک کر سکتا تھا۔

گولیاں چلانے والے نے گالیوں کے جلو میں پھر سنبل کو پکارا۔ کوئی مصلحت آڑے تھی یا اس کے دل میں گھنی جھاڑیوں میں اُترنے کا حوصلہ نہیں تھا کہ اوپر ہی کھڑا رہا تھا۔ کھوکھے کی جانب سے ایک آواز بلند ہوئی، ''نوری...... کچھ نظر آیا؟''

نوری کو کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ بولا، ''نہیں...... وہ کتے کی بچی اس طرف نہیں آئی۔ کسی اور طرف نکل گئی ہے۔ میں واپس آرہا ہوں۔''

اس کے ساتھی نے یہ دریافت نہیں کیا کہ اگر وہ دکھائی نہیں دی تھی تو فائرنگ کی آواز کیوں سنائی دی تھی۔

قدموں کی چاپ سے اندازہ ہوا کہ وہ واپسی کی راہ پر چل دیا تھا۔ ایسے میں ایک گڑبڑ ہوگئی۔ اس کا پیر کسی پتھر یا گیلے پتوں پر سے پھسل گیا تھا اور احمد کے عین سر کے اوپر عجیب سا شور برپا ہوگیا۔ چند پتھر ڈھلان میں لڑھک آئے۔ وہ بھی اترائی میں لڑھک آیا تھا جو سنبل کو تلاش کررہا تھا۔ دل کو ڈراتی ہوئی آوازوں کا جلوس اسی درخت کے موٹے تنے کی طرف آرہا تھا جس کی جڑوں میں اُگی ہوئی گھنی جھاڑی میں احمد اور سنبل دبکے ہوئے تھے۔

احمد نے خطرے کو فی الفور بھانپ لیا اور ایک جھٹکے سے سیدھا ہوگیا۔ سنبل کے ہاتھ اس کے کوٹ کی جیب میں دھنسے تھے۔ وہ گرتے گرتے بمشکل سنبھل پائی۔ عین اسی وقت ایک زوردار آواز گھاٹی میں گونجی۔ کسی ٹھوس آہنی شئے کے پتھر سے ٹکرانے کی آواز...... یوں لگا کہ نوری کے ہاتھ سے اس کی گن چھوٹ کر گر گئی تھی۔ یہی پرہیبت آواز دو تین مرتبہ سنائی دی اور نوری سے پہلے ہی اترائی میں لڑھکتی ہوئی دور چلی گئی۔ چونکہ اندھیرے میں اسے دیکھ لینا ممکن نہیں تھا، اس لیے احمد نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔

احمد کے کھڑا ہوتے ہی سنبل بھی کھڑی ہوگئی۔ پہلو بدل کر اس کی پشت پر آکر چپک گئی۔ احمد نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ ایسے میں اچانک پائن کے موٹے تنے والے درخت کے ساتھ کوئی شئے آن ٹکرائی۔ احمد نے جھاڑی کی شاخوں میں سے دیکھنے کی کوشش کی مگر کچھ نظر نہ آیا۔ چند لمحوں بعد کراہنے کی آواز سنائی دی۔ وہ نوری تھا جو لڑھکتا ہوا عین اسی درخت کے تنے سے آن ٹکرایا تھا۔ احمد نے برق مستعدی سے شاخیں ہٹائیں اور چیتے کی طرح نوری کی طرف لپکا۔ شاخیں یا درخت کی برہنہ جڑ پیروں میں الجھ گئی اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے جھاڑی میں گر گیا۔ اگر نشیب میں ہوتا تو کئی گز تک لڑھکتا چلا جاتا۔ جونہی اس نے سر اٹھایا، دائیں بائیں دیکھا، نوری کا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ گٹھڑی بنا جھاڑی تلے پڑا تھا۔

احمد کی پیشانی پر چوٹ آئی تھی مگر یہ وقت اس کی پروا کرنے کا نہیں تھا۔ اس نے اٹھنے اور نوری پر چھلانگ لگانے میں ثانیے بھر کی تاخیر بھی نہیں کی۔ نوری اس کے جسم تلے دب کر کراہنے لگا اور حواس باختہ ہوکر اس کے نیچے سے نکلنے کے لئے زور لگانے لگا۔ کراہوں کے ساتھ ساتھ اس کے منہ سے گالیاں برآمد ہورہی تھیں۔ اس کا لب ولہجہ مقامی تھا۔

احمد نے دایاں گھٹنا پوری قوت سے اس کے پیٹ میں مارا۔ اس کے حلق سے دبی دبی چیخ برآمد ہوئی۔ اس نے چاہا کہ دونوں ہاتھوں

سے احمد کو ایک طرف دھکیل دے مگر احمد نے اس کا ارادہ بھانپ کر اپنی ٹانگیں درخت کی ایک جڑ میں الجھالیں اور دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ کاربین بردار کی طرح لحیم شحیم نہیں تھا مگر گیا گزرا ہوا بھی نہیں تھا۔ اس نے لانگ کوٹ میں چھپے ہوئے احمد پر مکے برسانا شروع کر دیے لیکن اس کا کوئی وار کارگر نہیں تھا۔ زوردار مکا مارنے کے لئے بازو کو جتنی کھلی جگہ کی ضرورت تھی، اتنی جگہ اسے میسر نہیں تھی۔ چند ہی لمحوں میں اس کے حلق سے خرخراہٹ نکلنے لگی۔ احمد نے اپنے بدن کی پوری قوت اپنے ہاتھوں میں سمودی تھی۔

احمد چاہتا تھا کہ اسے اسی حالت میں جہانِ فانی سے رخصت کر دے مگر نوری کا جسم آخری جنگ سمجھ کر اس بری طرح تڑپا کہ نہ صرف اس کے دونوں ہاتھ گردن پر سے چھوٹ گئے بلکہ وہ خود بھی ایک طرف جا گرا۔ جڑوں میں پھنسے ہوئے پاؤں میں موچ آ گئی۔ درد کی شدت سے اس کے حلق سے کراہ خارج ہو گئی۔ ایسے ہی وقت سنبل سے غلطی سرزد ہو گئی۔ اس نے بے چین ہو کر پوچھا، ''احمد! کیا ہوا؟...... تم ٹھیک تو ہو ناں؟''

اس نے بے دھیانی میں اپنی آواز کو قدرے بلند رکھا تھا۔ نوری کے گرنے اور چیخنے کی آوازوں اور سنبل کے استفسار نے نوری کے ساتھی کو خطرے سے خبردار کر دیا تھا۔ وہ 'نوری نوری' پکارتا ہوا اس طرف چل پڑا تھا۔ اس کے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی تو احمد کے بدن میں نئی جان پڑی۔ اس نے پھنسا ہوا پاؤں نکالا اور غیر معمولی پھرتی سے اٹھنے کی کوشش کی۔ باوجود زخمی ہونے کے نوری اس سے پہلے اٹھ چکا تھا۔ اس نے چلاتے ہوئے پوری قوت سے پاؤں کی ٹھوکر اس کی پسلیوں میں رسید کی۔ وہ بلبلا اٹھا۔ کولہے میں پڑنے والی دوسری ٹھوکر نے اسے پستی میں لڑھکنے پر مجبور کر دیا۔ اگر وہ دفعتاً جھاڑی کی شاخیں نہ تھام لیتا تو اب تک کئی گز نیچے کھسک گیا ہوتا۔

نوری اس پر جھکا۔ اس کا مکا احمد کی پیشانی پر لگا۔ اسی جگہ پر کچھ دیر قبل چوٹ لگی تھی۔ گومڑ بن گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ سر کو دائیں بائیں پٹخ کر حواس بحال کرنے کی کوشش کی مگر اس دوران نوری نے جیسے مکوں کی مشین چلا دی تھی۔ یکے بعد دیگرے سر میں پڑنے والی خطرناک ضربوں نے احمد کے اوسان خطا کر دیے۔ اپنی پوری قوت بروئے کار لاتے ہوئے وہ چیخا، ''سنبل! بھاگ جاؤ......''

نوری کے ساتھی کے قدموں کی چاپ قریب آ گئی تھی۔ احمد کی چیخ سن کر نوری ایک دم جیسے ہوش میں آ گیا۔ اس نے پلٹ کر جھاڑی کے پار دیکھنے کی کوشش کی۔ سنبل دکھائی نہیں دی مگر پتہ چل گیا کہ وہ جھاڑی کے اندر ہی کہیں دبکی ہوئی تھی۔ نوری اور اس کے ساتھیوں کو وہی مطلوب تھی۔ اس نے احمد پر سے نگاہ ہٹانے کی غلطی کر لی تھی اور اسے یہ غلطی بہت مہنگی پڑی۔ دو تین سیکنڈز کی مہلت پا کر احمد نہ صرف کسی حد تک سنبھلنے میں کامیاب ہو گیا تھا بلکہ شاخوں کا سہارا لے کر چابک دستی سے نوری کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے پوری قوت سے نوری کی ناک پر مکا رسید کیا۔ نوری نے غیر ارادی طور پر سر کو گھمایا۔ ناک بچ گئی مگر کنپٹی مکے کی زد میں آ گئی۔ ضرب بہت زوردار

تھی۔احمد کا ہاتھ جھنجھنا کر رہ گیا تھا۔نوری کٹے ہوئے شہتیر کے مانند لہرایا۔درخت کے تنے کو تھام کر گرنے سے بچا مگر دونوں ٹانگوں کے بیچ پڑنے والے احمد کے گھٹنے نے رہی سہی کسر نکال دی۔نوری 'اوغ' کی کریہہ آواز برآمد کرنے کے بعد جونہی دونوں ہاتھ ٹانگوں میں دبا کر جھکا، احمد کی کہنی گرز کی طرح اس کی ریڑھ کی ہڈی پر لگی۔وہ آگے کی طرف جھکا۔احمد سے ٹکرایا اور پہلو کی جانب گر گیا۔

اس طرف اترائی تھی۔وہ کوشش کے باوجود نہ پاؤں زمین پر ٹکا سکا اور نہ کوئی شاخ یا جڑ ہی پکڑ سکا اور لحظہ بھر میں احمد کی نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔گہرائی میں جانے والے نوری کے ساتھ ان گنت چھوٹے بڑے پتھر بھی لڑھک رہے تھے جن کی مہیب صدائیں وادی میں گونج رہی تھیں۔وہ جس طرف گرا تھا، اس طرف تقریباً ڈیڑھ سو میٹر نیچے ایک ننھی سی ندی واقع تھی۔اگر نوری زندہ بچ بھی جاتا تو اس کا چار چھ گھنٹوں سے قبل ہوش میں آنا ممکن نہیں تھا۔ہوش میں آنے کے بعد اسے اس جگہ پر واپس آنے میں کم و بیش چھ کلومیٹر کا چکر کاٹنا پڑتا کیونکہ وہ خطرناک عمودی چڑھائی کی وجہ سے براہِ راست اوپر نہیں آ سکتا تھا۔

ایک خطرہ ٹل گیا تھا۔دوسرا سر پر آن پہنچا تھا۔نوری کا ساتھی بہت قریب آ گیا تھا۔احمد کے کان اس کے قدموں کی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔وہ وقتاً فوقتاً نوری کو پکارتا ہوا تیزی سے چلا آ رہا تھا۔نوری کی جانب سے جواب نہ پا کر سخت بھنایا ہوا تھا اور ناقابلِ اشاعت گالیوں سے بھی نواز رہا تھا۔

سنبل کی کانپتی ہوئی آواز ابھری، ”احمد! اس کا ساتھی نزدیک آ گیا ہے۔تم ادھر آ جاؤ۔“

قدموں کی چاپ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ احمد اور سنبل کے نقشِ پا پر چلتا آ رہا تھا۔چند ہی لمحوں میں جھاڑی سے پانچ سات قدموں کے فاصلے پر آ کر رک گیا۔بلند آواز میں بولا ”اوئے نوری کے بچے! کہاں ہو تم؟“

اس کی آواز خاصی بھاری اور کرخت تھی۔اس نے پھر نوری کو آواز دی۔پھر گن کا بولٹ چڑھنے کی آواز ابھری۔احمد اور سنبل نے سانسیں روک لیں۔وہ کم بخت اندھیرے میں گولیاں چلانے کا ارادہ رکھتا تھا۔گولی اندھی ہوتی ہے۔اس غضب کے اندھیارے میں گولی چلانے والا بھی اندھا تھا۔احمد نے زیرِ لب کہا، ”خدا خیر کرے......“

وہ دونوں درخت کے دونوں اطراف میں کھڑے تھے۔احمد دبے پاؤں تنے کی اوٹ میں پہنچا۔ہاتھ بڑھا کر سنبل کو لباس سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچ لیا۔اب وہ اندھی گولیوں سے وقتی طور پر محفوظ تھے۔نوری کا ساتھی چند منٹ تک جھاڑی کے باہر ایک تکونے پتھر پر کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا اور نوری کو آوازیں دیتا رہا۔اس کے پاس بیم لائٹ نہیں تھی یا اس وقت اس کا دھیان لائٹ آن کرنے کی طرف نہیں گیا تھا۔مایوس ہو کر حلق کے بل چیخا، ”اوئے نوری کے بچے......اوئے نوری......تم کہاں ہو؟“

نوری بے ہوش تھا یا وہاں تھا، جہاں اس کے ساتھی کی آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔مایوس ہو کر وہ پتھر سے اترا۔واپس جانے کے بجائے

پیش قدمی پر آمادہ نظر آیا۔ جھاڑی کے قریب پہنچ کر رک گیا۔شاید جھاڑیوں کے اندر اترنے کا حوصلہ نہیں پا رہا تھا۔ایسے میں ایک کھٹکا سا ہوا۔یوں لگا جیسے اسے ٹھوکر لگی ہو۔پھر اس کی خود کلامی ابھری، ''یہ تو نوری کی رائفل ہے......وہ خود کدھر گیا؟''

احمد کی حالت دِگرگوں تھی۔سر کی چوٹیں اور پاؤں کی موچ تکلیف دے رہی تھی۔تلاش کار کی اتنی قریب موجودگی پر جان الگ خطا ہو رہی تھی۔نجانے کس وقت کیا ہو جائے، یہ ڈر اسے بھی لاحق تھا اور سنبل کے رگ وپے میں بھی سرایت کر چکا تھا۔

نوری کی بندوق کے ملتے ہی شاید اس نے واپسی کا ارادہ موقوف کر دیا تھا۔یہ یقین ہو گیا تھا کہ نوری یہیں کہیں گرا تھا۔جواب نہیں دے رہا تھا تو یقیناً بے ہوش تھا یا قفسِ عنصری سے آزاد ہو چکا تھا۔دونوں صورتوں میں اسے تلاش کرنا ضروری تھا۔

احمد کی تمام تر احتیاط اکارت چلی گئی۔سرسراتی ہوا اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ کے بیچ سنبل کے حلق سے نکلنے والی تیز سسکی نے نوری کے ساتھی کو چونکا دیا۔اس نے گن سیدھی کی، غرایا، ''ادھر کون ہے؟''

احمد نے جلدی سے سنبل کو تھاما۔اس پر برسنے کا فائدہ نہیں تھا۔سرگوشی میں مستفسر ہوا، ''کیا ہوا؟''

وہ تھام نہ لی جاتی تو یقیناً پشت کے بل گر جاتی۔اب سنبھل گئی تھی۔اپنے پاؤں پر جھک گئی۔ہکلا کر بولی، ''وہ......وہ کسی کیڑے......نن......کاٹ لیا ہے......''

''اوہ......!'' احمد گھبرا سا گیا۔اس وادی میں گہرے نیلے رنگ کے فربہ اندام زہریلے بچھوؤں کی بہتات تھی۔ان کا زہر سانپ سے بھی زیادہ مہلک ثابت ہوتا تھا۔

ایسے میں نوری کے ساتھی نے سوال دہرایا۔جواب نہ پا کر کرخت لہجے میں بولا، ''اے! تم فوراً جھاڑی سے نکل آؤ، نہیں تو میں پوری جھاڑی کو اُڑا کر رکھ دوں گا۔''

وہ سہم کر احمد سے چمٹ گئی۔بولی، ''اب کیا ہوگا؟''

احمد نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ کر خاموش کرایا اور اپنی توجہ نووارد کی طرف مرکوز رکھی۔اس نے مزید سخت انداز میں دھمکی دی۔ کوئی ردعمل نہ پا کر اس نے اندھیرے میں یکے بعد دیگرے چار فائر داغ دیے۔ایک گولی درخت کے تنے میں لگی۔دوسری چنگاریاں جھاڑی کی شاخیں چھیل کر گیلی مٹی میں دھنس گئیں۔احمد درخت کے تنے کی آڑ میں رہ کر نیچے جھکا۔خوش قسمتی سے ایک ننھا سا پتھر ہاتھ لگ گیا۔اس نے ہاتھ نکالا اور اندازے کے مطابق گن بردار کو دے مارا۔نشانہ خطا گیا۔جواب میں وہ غرایا، ''اوئے......بھتنی کی اولاد......میں سمجھ گیا ہوں تم سنبل ہو۔آخری بار کہہ رہا ہوں کہ باہر نکل آؤ نہیں تو......''

اس نے ایک غلیظ گالی دی اور پھر اوپر تلے دو فائر داغ دیے۔وہ مختلف زاویوں پر فائر کر رہا تھا۔نہ دکھائی دینے والی کو چھلنی کرنا چاہتا

تھا۔ احمد نے دوسرا پتھر اٹھانے کی کوشش کی۔ پتھر نہ ملا۔ اپنے ساتھ چمٹی ہوئی سنبل کے کان میں بولا، ’’تم یہیں کھڑی رہو۔ میں اس طرف سے نکلتا ہوں اور اس بے غیرت کے عقب میں پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔‘‘

سنبل نے اسے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا، ’’نہیں احمد...... تم کہیں نہیں جاؤ گے۔‘‘

یہ وقت بحث کا نہیں تھا۔ وہ تھم گیا۔ گاہے بگاہے سنبل کے منہ سے برآمد ہونے والی ’سوں سوں‘ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کیڑے کے کاٹنے کے سبب تکلیف میں تھی مگر غیر معمولی برداشت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ احمد کا ذہن بیک وقت حملہ آور سے نبرد آزمائی اور سنبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ حملہ آور سے فی الفور چھٹکارا پانا ضروری تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ دیر ہو جانے کی صورت میں سنبل کے پورے جسم میں زہر سرایت کر جائے گا۔ اس صورت میں وہ اپنے پیروں پر چلنے کے قابل نہیں رہے گی۔

اس نے ایک دم اپنی حکمت عملی بدلی اور سنبل کو خود سے علیحدہ کر کے درخت پر چڑھنے لگا۔ پائن کے سیدھے تنے پر چڑھنا عام آدمی کا کام نہیں، مگر وہ عام نہیں تھا۔ اسی وادی کا پروردہ تھا۔ اس کے ایک ایک راز کا امین تھا۔ بندر کی سی مستعدی سے دس فٹ کے لگ بھگ اونچا اٹھ گیا اور ایک ٹوٹی ہوئی شاخ کی سوکھی اساس پر پیر ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ اندھیرے میں حملہ آور دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ ناکام رہا۔ سوچنے لگا کہ اسے فائر کرنے پر کیسے اکسائے۔ اگر وہ کوئی شاخ توڑتا تھا تو اس کی لوکیشن عیاں ہوتی تھی۔ ایسے میں قسمت نے اس کی مدد کر دی کہ اسے از خود فائر کرنے کا خیال آ گیا تھا۔

اس نے برسٹ لیور کھینچا اور ٹرائیگر دبا کر گن کو دائیں بائیں گھما دیا۔ ریٹ...... ریٹ...... کی کان پھاڑ آواز نے وادی کو دہلا کر رکھ دیا۔ گولیوں نے جھاڑی کا چپا چپا چھیل کر رکھ دیا تھا۔ درخت کی مخصوص لرزش سے احمد کو پتہ چلا کہ چار پانچ گولیاں تنے میں پیوست ہوئی تھیں۔ گن بردار نے ٹرائیگر پر سے انگلی اس وقت ہٹائی جب ’ٹرچ‘ کی مخصوص آواز سنائی دی۔ گن کی میگزین یا بیلٹ خالی ہو گئی تھی۔ احمد نے فائر فلیمنگ کی وجہ سے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ جھاڑی کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ اس نے جھک کر نوری کی گن اٹھائی۔ اپنی گن کو کندھے پر لٹکایا۔ اس تبادلے کے درمیان کی مختصر مہلت سے احمد فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اس نے تاخیر نہیں کی اور تنے پر پاؤں ٹکا کر پوری احتیاط کے ساتھ اس پر چھلانگ لگا دی۔

اس کا ارادہ گن بردار پر گرنے کا تھا مگر اندازے کی تھوڑی سی چوک کے سبب وہ اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن پر گرا۔ اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ غالباً ہاتھ پر چوٹ لگی تھی کیونکہ اس کے حلق سے کراہ کے ساتھ ’کون ہے۔ تیری تو......‘ کی خرخراتی مگر تحیر آمیز آواز برآمد ہوئی۔ احمد پہلو کے بل اس کے قدموں میں گرا۔ موچ والے پاؤں میں ٹیس اٹھی مگر اس کی مطلق پروانہ کرتے ہوئے وہ برق بلا کی طرح اچھلا اور گن بردار پر چڑھ دوڑا۔ اس نے کندھے پر لٹکتی ہوئی بندوق سمیت اسے بانہوں میں جکڑ لیا اور رگیدنے لگا۔

جگہ کم تھی۔دونوں اوپر نیچے پتھروں پر گرے۔وہ پہل کر گیا۔اس نے احمد کے پیٹ میں زوردار مکا جڑا اور بے پناہ تیزی سے اسے دونوں ہاتھوں پر اچھال دیا۔وہ اس کے پہلو میں منہ کے بل گرا۔کوئی پتھر گال میں چبھ گیا۔درد کی کٹیلی ٹیس پورے بدن میں پھیل گئی۔

وہ ناگ کی طرح پھنکارا۔پھیلے ہوئے ہاتھ کو دائیں بائیں گھمایا۔ایک پتھر ہاتھ لگ گیا۔اٹھتے ہوئے گن بردار کو دیکھے بغیر دے مارا۔اس کے گھٹنے پر لگا۔وہ ’ہائے‘ کی آواز نکال کر جھکا۔ساتھ ہی اس نے کھڑی ہتھیلی کا خطرناک وار کیا۔احمد کی گردن بچ گئی۔کندھا جیسے ٹوٹ گیا۔بازو آنِ واحد میں شل ہو گیا۔اس نے دوسرے ہاتھ میں تھاما ہوا پتھر پھر گھمایا۔گن بردار کے حلق سے دردناک چیخ برآمد ہوئی۔اس کے بدن کے کسی نہایت حساس حصے پر چوٹ لگی تھی۔احمد نے اس کے بعد اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا اور پے در پے پتھر مار مار کر چاروں شانے چت کر دیا۔اسے قطعی طور پر دھیان نہیں تھا کہ اس کے ہاتھ میں تھاما ہوا پتھر گن بردار کو کہاں کہاں لگ رہا تھا۔وہ جونہی لہرا کر گرا، احمد اس کی چھاتی پر چڑھ گیا۔اس نے پتھر والا ہاتھ اٹھایا اور پوری قوت سے اس کی پیشانی پر دے مارا۔اس کا بدن گویا آخری مرتبہ پھڑکا پھر ساکت ہو گیا۔احمد نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔دھڑکن محسوس کی۔وہ زندہ تھا مگر اب تب میں رخصت ہونے والا تھا۔اس نے اپنا ہاتھ نہیں روکا اور اس کی کھوپڑی پر پتھر مار مار کر اس کا آخری سفر آسان کر دیا۔

احمد تھک گیا تھا۔پتھر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر لاش کے کندھے اور گردن کی وادی میں ٹک گیا تھا جبکہ وہ دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھے نڈھال انداز میں اس پر جھکا ہوا تھا۔اس کے جسم میں لرزش تھی۔آنکھیں نم تھیں۔سر اور موچ زدہ پیر کے بعد کندھے سے بھی درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔کئی لمبی لمبی سانسیں لے کر اٹھا۔دانت کچکچائے اور پاؤں کی زوردار ٹھوکر چت پڑے سورمے کی پسلیوں میں رسید کی۔وہ دنیا کے ہر غم سے آزاد ہو چکا تھا، اُسے کیا ہونا تھا، احمد کے اپنے حلق سے سسکاری نکلی۔وہ جوش میں اسی پاؤں کو حرکت دے بیٹھا تھا جس میں موچ آئی تھی۔

اس نے چھوٹی نال والی گن مردہ کندھے سے کھینچی، اس کی میگزین نکال کر دیکھی۔خالی تھی۔اس نے جھک کر منہ سے آخری خرخراہٹ نکالنے والے کے لباس کی تلاشی لی۔اس کے پاس فالتو میگزین یا گولیاں نہیں تھی۔چھوٹے سائز کا پسٹل برآمد ہوا۔اس کی میگزین میں چار گولیاں تھیں۔یہی بہت تھیں۔اس نے پسٹل کو اپنی قمیص کی جیب میں ڈال لیا اور گن کو پھینک کر جھاڑی کی طرف بڑھا۔ایسے میں سنبل نے پکارا،”احمد......احمد......تم ٹھیک تو ہوناں؟“

وہ تھکے تھکے لہجے میں بولا،”ہاں!میں ٹھیک ہوں اور اب تمہاری طرف آ رہا ہوں۔“

چند لمحوں بعد وہ سنبل کے پاس تھا،”کم بخت خاصا سخت جان تھا۔“

سنبل بولی،”تم نے اسے مار دیا؟“

''ہاں! جس کے ہاتھ میں گن آجاتی ہے، وہ زورِ بازو پر لڑنا بھول جاتا ہے۔''

جواب میں سنبل نے کچھ نہیں کہا۔ وہ تکلیف میں تھی۔ احمد نے پوچھا، ''درد کم ہوا؟''

وہ بولی، ''ہاں! کم ہوگیا مگر ابھی ختم نہیں ہے۔''

اس نے لائٹر نکالا۔ ٹارچ روشن کی۔ سنبل کے پیروں میں بیٹھ گیا۔ پوچھا، ''کیڑے نے کہاں کاٹا تھا؟''

وہ بھی بیٹھ گئی۔ بائیں پاؤں کے ٹخنے کی طرف اشارہ کیا۔ احمد نے ٹارچ کی روشنی میں ٹخنہ دیکھا۔ ننھا سا سرخ دائرہ دکھائی دیا۔ زمین پر روشنی ڈالی۔ سنہرے رنگ کے چند چیونٹے دکھائی دیے۔ ایک طویل سانس لے کر بولا، ''فکر کی بات نہیں۔ چیونٹے نے کاٹا ہے۔ تھوڑی دیر میں رہا سہا درد بھی ختم ہو جائے گا۔''

احمد نے اسی حالت میں بیٹھے رہ کر اپنے موچ والے پاؤں کو دبایا۔ درد میں کچھ افاقہ ہوا۔ پھر ٹانگیں پسار کر، درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگیا۔ جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی۔ ایک لمبا کش سینے میں اتارا۔ ہلکی کھانسی آئی۔ سنبل اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ ہمدردی آمیز لہجے میں بولی، ''سگریٹ نہ پیا کرو۔ کینسر ہو جاتا ہے۔''

''آئی ڈونٹ کیئر......'' اس نے لاپروائی سے کہا اور آنکھیں موند لیں۔ وہ گہری سوچ میں تھا۔ اس کے ہاتھوں دو یا تین افراد قتل ہو گئے تھے۔ وہ زندگی میں کبھی عام نوع کے بھی کسی جرم کا مرتکب نہیں ہوا تھا۔ کجا، ایک رات میں تین قتل......سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے؟......ابھی رات کا بڑا حصہ باقی تھا۔ کیا ساری رات ایسے ہی مارا ماری میں گزرنے والی تھی؟......ان جانکاہ حالات سے بچنے کی کیا ترکیب کی جا سکتی تھی؟......دفعتاً اس نے سوچا کہ اب خطرہ ٹل گیا ہے اور وہ سنبل کو لے کر اپنے گھر چلا جائے مگر ساتھ ہی ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ سنبل کے تین تلاش کاروں کا تیا پانچہ ہو چکا تھا۔ اس کی تلاش میں کتنے افراد وادی میں گھوم رہے تھے، اس بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ اس نے از روئے احتیاط سنبل سے دریافت کیا، ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے تعاقب میں کتنے افراد نکلے ہیں؟''

اس نے کہا، ''نہیں...... مجھے تو ان کے بارے میں بھی علم نہیں تھا۔''

''کیا ان کے علاوہ بھی کوئی ہو سکتا ہے؟''

سوال غیر ضروری تھا۔ سنبل نے جواب دیا، ''پربت شاہ کے پاس ایسے بندوں کی کمی نہیں ہوگی۔''

پربت شاہ کا نام ایک بار پھر اس کی زبان پر آیا تھا۔ حیرانی سے بولا، ''پربت شاہ کو تم سے کیا پرخاش ہے؟''

''کوئی نہیں۔''

''پھر یہ ڈنڈا ڈولی کیوں ہو رہی ہے؟'' اس کا لہجہ قدرے طنز بار تھا۔

''میرا یہاں سے جانا اس کے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔ اس لیے وہ ہر صورت پر مجھے پکڑنا چاہے گا۔'' اس نے احمد کے طنز کو اہمیت نہیں دی تھی۔

''میں پانچ سال پہلے والے پربت شاہ کو جانتا ہوں۔ اس وقت وہ ایسا نہیں تھا۔'' احمد نے سوچتے ہوئے کہا۔

''میں نے گزشتہ چند دنوں میں اسے جتنا دیکھا ہے، کافی ہے۔ وہ اس دنیا کا سب سے بڑا شیطان ہے۔ کیا تم میری بات پر یقین کرو گے؟'' سنبل کے لہجے میں زہر بھر گیا۔

اس نے آہستگی سے کہا، ''میرے پاس تمہاری بات کو رد کرنے کیلئے کوئی ٹھوس وجہ نہیں ہے۔''

باتوں کے دوران وہ احمد کے بہت قریب کھسک آئی تھی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے کوٹ کی جیبوں میں ڈال دیے تھے۔ احمد کو اپنے چہرے پر اس کی سانسیں محسوس ہوئیں۔ عجیب سی کیفیت بیدار ہوئی۔ بولا، ''بہتر ہوگا کہ تم مجھ سے تھوڑا فاصلہ کرلو۔''

وہ نفی میں سر ہلا کر بولی، ''نہیں پلیز! بہت سردی ہے اور میرا جسم دکھ رہا ہے۔ تمہارا کوٹ بہت گرم ہے۔ مجھے سکون دیتا ہے۔''

وہ سردی کو بھولے بیٹھا تھا حالانکہ وہ مسلسل اپنا آپ دکھائے جا رہی تھی۔ اس نے سگریٹ پی لی تھی، بجھائی، اپنے جاگرز کے تسمے کھولے اور جرابیں اتار کر سنبل کو دے دیں، ''انہیں پہن لو۔ کیڑے مکوڑوں اور سردی سے بچ جاؤ گی۔''

اس نے بلا تردد اس کی بات مان لی۔ اسے جرابیں خاصی ڈھیلی تھیں۔ احمد نے مشورہ دیا، ''پینٹ کے اوپر سے پہنو......''

اس نے پینٹ کے پائنچے جرابوں کے اندر گھسیڑ دیے۔ احمد نے اپنے دستانے بھی اس کے حوالے کر دیے۔ وہ بولی، ''اس طرح تو تمہیں سردی لگ جائے گی۔''

اس نے ہنکارا بھرا۔ بولا، ''اب کیا کریں؟''

وہ بھی گویا دل ہی دل میں اس سوال سے پریشان تھی۔ بولی، ''مجھے تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کیا ہم اس وادی سے باہر نہیں نکل سکتے؟''

اس نے کچھ سوچ کر کہا، ''دو راستے ہیں۔ ایک وہ جس پر سے گزر کر ہم یہاں پہنچے ہیں۔ ادھر بلندی ہے۔ سردی زیادہ ہوگی۔ دوسرا راستہ اسی طرف اترائی میں واقع ہے۔ اترائی بہت خطرناک ہے۔ نیچے ندی بہتی ہے۔ اس کے کنارے چلتے چلتے ہم اس پہاڑی کی دوسری طرف جا سکتے ہیں۔ یہ سڑک ہمیں چند کلو میٹر کے فاصلے پر مل سکتی ہے۔ یا ندی کو چھوڑ کر ہم کالکوٹ کی طرف بھی جا سکتے ہیں۔ وہ راستہ زیادہ دشوار ہے۔''

''تمہارا گھر کہاں ہے؟''

''سندر بن میں...... جہاں سے تم آئی ہو۔ کیا میرے گھر چلو گی؟''

''اوہ نہیں...... ادھر تو میں ہر گز نہیں جاؤں گی۔ فار گاڈ سیک...... مجھے اس موت کی وادی سے باہر نکالو ورنہ میں خوف اور دہشت سے ہی مر جاؤں گی۔''

''مجھے احساس ہے کہ سندر بن کی طرف جانا اب بہت خطرناک ہوگا۔ راہ میں کہیں بھی تمہارے دشمنوں سے مڈبھیڑ ہو سکتی ہے۔ جہاں ہم بیٹھے ہیں، یہاں قدرے نگھ (حدت) ہے۔ اوپر بہت سردی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں ندی کی طرف اترنا چاہیے۔'' احمد نے تشویش زدہ انداز میں کہا۔

''کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہم کسی محفوظ جگہ پر رات کا بقیہ حصہ گزار لیں اور دن چڑھتے یہاں سے نکل جائیں؟'' سنبل نے امید بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

احمد نے نفی میں سر ہلایا، ''اس کھوکھے اور اس جھاڑی سے زیادہ محفوظ مورچہ کیا ہوگا؟...... ویسے بھی دن کی روشنی میں ہمارا یہاں سے نکلنا مزید مشکل ہو جائے گا۔''

احمد نے درست کہا تھا۔ سنبل سوچ میں پڑ گئی۔ پھر بولی، ''تو پھر ہم بیٹھے کیوں ہیں، چل پڑیں ناں!''

''چلو!'' احمد نے اٹھنا چاہا۔ اس کا ارادہ بھانپ کر سنبل بھی کھڑی ہوگئی۔ احمد نے ہاتھ بڑھایا، سنبل نے تھام لیا۔ زندگی کی ڈگر پر ایسے ہی کسی کا ہاتھ تھاما جاتا ہے، کسی کا چھوڑ دیا جاتا ہے مگر سفر جاری رکھا جاتا ہے۔ احمد نے درست کہا تھا۔ راستہ دم بہ دم بہت مشکل ہو رہا تھا۔ جونہی ایک کگر پر احمد نے ہاتھ رکھے، وادی فائرنگ کی ہولناک آوازوں سے گونج اٹھی۔ اس نے رک کر فائرنگ کی سمت کا اندازہ کیا۔ سندر بن کی جانب واقع گھنے جنگل سے آواز آ رہی تھی۔ وہ بے ساختہ بولا، ''ایک سے زیادہ گنیں گولیاں اگل رہی ہیں۔''

سنبل کا حلق سوکھ گیا۔ کراہی، ''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

احمد نے کندھے اچکائے، ''اس صورتِ حال میں تمہیں ڈر لگنا بھی چاہیے۔''

فائرنگ کی آواز نے اس طلسم کو توڑ دیا جو احمد اور سنبل کے ذہنوں پر احساسِ تحفظ نے طاری کر دیا تھا۔ ان کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔ پہاڑی کے دامن میں بغیر راستے کے پیر جما جما کر چلنا خاصا تکلیف دہ تھا۔ قدم قدم پر سنبل کو سہارا دینا پڑتا تھا جس کی وجہ سے سفر کی رفتار خاصی سست تھی۔

ایک بڑی چٹان کے عقب میں پہنچ کر سنبل نے پھولی سانسوں کے درمیان کہا، ''دو منٹ پلیز...... مجھ سے اب چلا نہیں جا رہا۔''

''اوہ نہیں ناں......ابھی تو فرلانگ بھر سفر بھی نہیں کیا ہم نے......خیر! ادھر ہی بیٹھ جاؤ۔''

وہ بیٹھ گئی۔ احمد چٹان کے ساتھ کمر ٹکا کر بولا''فائرنگ رک گئی ہے۔ لگتا ہے پربت شاہ کے فائرنگ اسکواڈ کو کسی جانور نے امتحان میں ڈالا تھا۔''

وہ بولی،''شاید ایسا ہی ہو۔''اس کی آواز کپکپا بھی رہی تھی،''کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ ہم تک نہیں پہنچ سکیں گے؟''

وہ بولا''ہاں! مگر میرا ایسا یقین دو مرتبہ ہار چکا ہے۔''

وہ کچھ نہیں بولی۔ چند منٹ گزر گئے۔ دونوں اپنی اپنی سوچوں سے نبرد آزما رہے۔ خاموشی کا گلا احمد نے گھونٹا، کہا،''اٹھو......اب ہمیں چلنا ہوگا۔''

سنبل کچھ کہے بغیر کھڑی ہوگئی اور احمد کے پہلو سے جڑ کر چلنے لگی۔ قدرے شرمندہ انداز میں بولی،''اگر تم نہ ہوتے میں یقیناً اب تک مر چکی ہوتی۔''

''جسے زندہ رہنا ہے، اسے زندہ رہنا ہے اور جسے مرنا ہے، اسے کوئی بچا نہیں سکتا۔ البتہ یہ بات یقینی ہے کہ اگر تم مجھے نہ ملتیں تو میں اس وقت گرم لحاف کے مزے لوٹ رہا ہوتا۔''

''میں نے تم پر اپنی مصیبت لاد دی۔ میں بہت بری ہوں۔''وہ روہانسی ہوگئی۔

''ایسی ناکارہ گفتگو کر کے میرا مورال ڈاؤن نہ کرو۔ تمہیں جنگ لڑنے کے آداب زندگی نے شاید نہیں سکھائے۔''احمد کا لہجہ سخت ہرگز نہیں تھا۔

وہ شرمسار ہوگئی۔ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ توقف کے بعد بولی،''تم نے میرے لیے اپنی زندگی داؤ پر کیوں لگائی، مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آرہی۔''

جھاڑیوں کے بیچ راستہ بناتے ہوئے بولا،''آسان سی بات ہے کہ تم لڑکی ہو......خوب صورت بھی ہو......تمہیں دیکھتے ہی میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ تمہیں مرنا نہیں چاہیے۔''

صاف عیاں تھا کہ وہ شگفتہ گفتگو کر کے اسے سنبھالا دینے کا خواہاں تھا۔ اگر وہ پست حوصلہ ہوجاتی تو احمد ہی کے لئے وبالِ جان بن جاتی۔ اس نے پوچھا،''تمہیں ابھی تک بخار نہیں ہوا......کیا تمہارا ارادہ بدل گیا ہے؟''

وہ چونک کر رک گئی۔ بولی،''آئی سیلوٹ یو احمد...... یو آر ویری بریو مین......میرا ان حالات میں دم گھٹ رہا ہے جبکہ تم پوری طرح اپنے حواس میں دکھائی دے رہے ہو حالانکہ تم بھی اتنے ہی پریشان ہو جتنی میں ہوں۔''اس کے لہجے میں ستائش بھری ہوئی تھی،''بائی دا

وے! میرا جسم دکھ رہا ہے اور پہلے سے زیادہ سردی لگنے لگی ہے۔ بخار ہو گیا ہے۔''

وہ زیرِ لب مسکرایا۔ سنبل کے لہجے نے چغلی کر دی تھی کہ وہ خوف کی خطرناک ٹرانس سے نکل آئی تھی۔

''باہر نکلنے سے پہلے لباس تو ڈھنگ کا پہن لیتیں۔''

''تو کیا یہ ڈھنگ کا نہیں ہے؟'' وہ چونکی۔

''میرا گرم لباس سے مطلب تھا۔'' وہ ہنسا۔

''کہاں سے لیتی؟'' اس کی سانسیں سفر کی تاب پر پھولنے لگی تھیں، ''جہاں مجھے رکھا گیا تھا، وہاں سوائے ایک گندے لحاف اور گدے کے کچھ بھی نہیں تھا۔ میرے پاس تو جوتے بھی نہیں تھے۔ کیا میں گرم کپڑوں اور جوتوں کے انتظار میں وہیں بیٹھی رہتی یا ان کتوں کو ایک لسٹ تھما دیتی کہ میں یہاں سے بھاگنا چاہتی ہوں، اس لیے مجھے یہ سامان فراہم کیا جائے......''

سنبل کے لہجے کی تندی نے احمد کو باور کرایا کہ اس نے احمد کی بات کا برا مانا تھا۔ بولا ''ڈونٹ بی ہاٹ...... ہمارے درمیان نرم گرم ڈائیلاگز تو چلتے ہی رہیں گے۔''

''اوہ ساری...... میں...... میں......''

احمد نے اس کا دستانے میں چھپا ہوا ہاتھ تھام رکھا تھا، ہولے سے دبایا، گویا سمجھایا کہ 'کوئی بات نہیں'۔

اب وہ اتنی اترائی میں آ گئے تھے کہ سندربن بہت اوپر رہ گیا تھا۔ پہاڑی کے دامن میں باہر کو نکلی ہوئی ایک بڑی چٹان کو دیکھ کر احمد نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ اندھیرے کے باوجود بھٹکا نہیں تھا بلکہ اندازے کی بنا پر منزل کی طرف کامیابی سے گامزن تھا۔ چٹان اور پہاڑی کے درمیان نہایت تنگ جگہ تھی جہاں سے دونوں کو گزرنا تھا۔ احمد کو بخوبی یاد تھا کہ چٹان کے عین وسط میں ایک گڑھا نما گہری کھائی واقع تھی۔ اس میں گرنے کا مطلب ہڈی پسلیوں کا سرمہ بنوانا تھا۔ اس نے سنبل کو اپنے پیچھے احتیاط سے چلنے کا کہا۔ اندازے کے مطابق وسط چٹان سے کچھ پہلے رک گیا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ اندھیرے کا کامل راج تھا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ اگر لائٹر ٹارچ روشن کرتا تو اپنی نشاندہی کر بیٹھتا۔ اگر یہ خطرہ مول نہ لیتا تو گہرے گڑھے میں گر جاتا۔ رکا تو سنبل نے پوچھا، ''رک کیوں گئے؟''

''یہاں ایک گڑھا ہے۔ اس میں گرنے والا پاتال میں پہنچ جاتا ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ روشنی کروں یا نہ کروں۔''

''یہ علاقہ تمہارا دیکھا بھالا ہے۔ تم مجھ سے بہتر فیصلہ کر سکتے ہو۔'' سنبل نے کہا۔

اس نے دل ہی دل میں اللہ کا نام لیا اور لائٹر کو زمین کے قریب کر کے آن کر دیا۔ گڑھا ابھی دور تھا۔ وہ جھکی ہوئی حالت میں قدم بہ قدم آگے بڑھنے لگا۔ ایسی کیفیت میں چلنا بہت تھکن آور ہوتا ہے۔ سنبل اس کے عقب میں چل رہی تھی۔ چند گز کے فاصلے پر گڑھا

دکھائی دے گیا۔ اس میں اندھیرا ابھرا ہوا تھا...... بسیط اندھیرا...... ماحول پر چھائے ہوئے اندھیرے سے بھی زیادہ ڈراؤنا...... سنبل کے لبوں سے بے ساختہ نکلا، ''اوہ مائی گاڈ! کتنی خوف ناک جگہ ہے یہ۔''

احمد نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چھپکلی کے مانند بہ آسانی چٹان کے ساتھ چپک کر وہ گڑھا عبور کر سکتا تھا۔ بچپن میں کئی مرتبہ یہ تجربہ کر چکا تھا۔ سنبل کا فکر تھا کہ وہ دواڑھائی گز چوڑائی پر حائل موت کا کنواں عبور نہیں کر سکے گی۔ اس نے لائٹر سنبل کو تھمایا۔ اپنا لانگ کوٹ اتارا اور گڑھے کے پار پھینک دیا۔ سرد ہوا نے یکا یک بدن چیر کر رکھ دیا۔ دل کو دکھ سا ہوا کہ سنبل نے رات کی اس جان لیوا سرد ہوا کو ایک عام سی ٹی شرٹ کے سہارے پر جھیل رکھا تھا۔ اس نے کوٹ کے بعد جاگرز اتار کر کوٹ پر پھینک دیے۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر نمی زدہ چٹان پر رکھ دیے اور دونوں پاؤں چٹان کے نچلے حصے میں کہیں گھسا دیے۔

سنبل کو گڑھے کی انتہائی حد پر کھڑا ہونے کا اشارہ کیا اور خود چٹان سے چمٹ کر نہایت سست رفتاری سے دوسری طرف جانے لگا۔ ایسے میں وہ انسان کم اور چھپکلی زیادہ نظر آ رہا تھا۔ اڑھائی گز کی طوالت پر محیط وہ مختصر سا سفر کوئی پانچ منٹ میں طے ہوا۔ اس دوران سنبل سانس روکے، ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتی رہی۔ ہر لحظہ دل دے دعا نکل رہی تھی کہ گیلی چٹان پر اس کے ہاتھ نہ پھسلیں۔ اسے اس موت کے کنویں کی گہرائی کا اندازہ نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو وہ کبھی بھی احمد کو پار نہ جانے دیتی۔ ایسے میں ایک اور پریشانی نے دل میں گھر کر لیا۔ احمد کے بعد اسے اسی تجربے سے دوچار ہونا تھا۔ کیا وہ اس انداز سے گڑھا عبور کر پائے گی؟

جونہی احمد نے گڑھے کے پار زمین پر قدم رکھا، وہ نیچے بیٹھ گیا۔ کئی ثانیے ایسے ہی گزر گئے۔

سنبل گھبرا گئی، ''کیا ہوا احمد...... تم ٹھیک تو ہوناں؟''

اس نے ایک طویل سانس حلق میں اتاری۔ تھکی سی آواز میں بولا، ''ہاں! سمجھو کہ سولی پر سے نیچے اترا ہوں۔ دماغ ایک دم ماؤف ہو گیا ہے۔ ڈونٹ بی وری...... آئی ایم او کے......''

وہ کئی ساعتیں ایسے ہی سر تھام کر بیٹھا رہا۔ وہ پوری طرح دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر اس کا ہیولا اس کی حرکات کی خبر رسانی کر رہا تھا۔ پھر وہ اپنی توانائیاں بحال کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے لائٹر ٹارچ اپنے پیروں میں روشن کر کے رکھ دی۔ بولا، ''سنبل! اس گڑھے کی چوڑائی اڑھائی گز ہے۔ تمہیں چھلانگ لگا کر اس طرف آنا ہے۔ کیا ایسا کر لوگی؟''

وہ قدرے سہم گئی۔ مستفسر ہوئی، ''مجھے گز کی سمجھ نہیں آتی۔ تم یہ فاصلہ فٹوں میں بتاؤ۔''

احمد نے بتایا، ''یہی کوئی آٹھ فٹ بنے گا۔''

وہ مزید ڈر گئی۔ بولی، ''نہیں نہیں...... اتنا جمپ تو کھڑے پیروں نہیں لیا جا سکتا ناں...... پیچھے سے دوڑ کر آؤں تو ممکن ہے مگر پھر یہ

کنارہ دکھائی نہیں دے گا۔“

احمد نے سر ہلایا۔ وہ اس سچویشن کو پہلے ہی سمجھ چکا تھا۔ بولا ”ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔“

اس نے پاؤں چٹان کے نیچے بنی ہوئی ننھی سی کھوہ میں پھنسائے، کوٹ کی ایک آستین کو بائیں ہاتھ میں پکڑ کر کلائی پر لپیٹ لیا اور دایاں ہاتھ چٹان پر جماتے ہوئے کہا، ”تم اس کوٹ کو مضبوطی سے پکڑ کر چھلانگ لگا دو۔ دھیان رکھنا کہ تمہارے دونوں پیر لائٹر تک پہنچیں ورنہ گڑ بڑ ہو جائے گی۔ اگر تم گڑھے میں لٹک بھی جاؤ تو کوٹ کو نہ چھوڑنا۔ لو پکڑ لو، دونوں ہاتھوں سے......“

اس نے کوٹ جھلایا۔ پہلی بار سنبل اسے تھام نہیں پائی۔ دوسرے جھلارے میں کامیاب رہی۔ لرزیدہ آواز میں بولی، ”دیکھ لو، میں گر تو نہیں جاؤں گی۔“

”اگر تم ہوش میں رہو گی تو نہیں گرو گی۔ ڈرو گی تو میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر پاؤں گا۔“

وہ کوٹ کو پکڑے دم بخود کھڑی تھی۔ احمد کوٹ کو ننھے ننھے جھٹکے دے کر چھلانگ لگانے پر اکسا رہا تھا۔ ایسے میں اوپر سندر بن کے جنگل کی طرف دو فائر گونجے۔ اسے تلاش کرنے والے دور تھے مگر اپنے ہونے کا احساس دلا رہے تھے۔ وہ تیز آواز میں بولی، ”احمد......میں آ رہی ہوں۔“

اس نے لائٹر ٹارچ کو دیکھا اور آنکھیں بند کر کے چھلانگ لگا دی۔ یہ اس کے اندرونی خوف کا غماز عمل تھا وگرنہ کھلی آنکھوں سے بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے دونوں پاؤں گڑھے کی نکڑ پر لگے۔ بدن کو تیز جھٹکا لگا۔ ایک بار تو احمد کو بھی ایسا لگا کہ وہ گڑھے میں گرنے والا ہے۔ مضبوط اعصاب کا مرد تھا۔ سنبھل کر کھڑا تھا۔ جلدی سے بولا، ”کوٹ نہ چھوڑنا......“

یہ کہنا اضافی تھا۔ وہ نادان نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ بڑی سختی سے کوٹ پر جمے ہوئے تھے اور وہ نکڑ پر ٹکے ہوئے دونوں پیروں کے بل اوپر اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ احمد کا تنا ہوا ہاتھ میکانکی انداز میں پیچھے کی طرف ہٹ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے جھٹکا نہ لگے کیونکہ ایسی حالت میں اسے اپنا توازن برقرار رکھنا مشکل ہو سکتا تھا۔ چند ہی لمحوں میں اس کی محنت رنگ لائی اور سنبل اس کے پہلو سے گھسٹتی ہوئی آگے نکلی اور چٹان اور پہاڑی کی بیچ کی تنگ سی جگہ پر اوندھے منہ جا گری۔ اس نے کوٹ ابھی تک نہیں چھوڑا تھا جس کی وجہ سے احمد بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور دھپ سے اس پر جا گرا۔ اس نے اٹھنے میں لحظہ بھر کا وقت لیا۔ کھڑا ہوا۔ بے ساختہ لبوں سے نکلا، ”مالک! تیرا شکر ہے......یہ گندم کی بوری تو بہت بھاری بھرکم ہے۔“

اس کی بات سنبل نے سنی۔ جلدی سے اٹھی اور اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس سے چمٹ گئی۔ وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ پہلے کوٹ کی موجودگی میں اسے بانہوں میں نہیں بھر سکتی تھی۔ اب کوٹ پیروں تلے پڑا تھا اور وہ سینے سے لگی ہوئی تھی۔ ایسی کیفیت میں چند

گھڑیاں گزریں۔اس کا بدن تہلکہ خیز تھا۔آن کی آن میں تہس نہس کر گیا۔جب تک وہ سنبھلتا،اپنی سانسوں پر اختیار کھو بیٹھا تھا۔وہ اس کے سینے پر اپنا چہرہ رگڑ رہی تھی،کانپ رہی تھی اور لرزش بار آواز میں ہولے ہولے کہہ رہی تھی،''یو آر بریو مین......آئی لو یو...... مجھے یقین ہو چلا ہے کہ میں زندہ رہوں گی۔تم میرے ساتھ ہو تو میں مر نہیں سکتی۔تھینک یو احمد!''

وہ بے ربط بول رہی تھی۔اس کا بخار زدہ گرم بدن کوئی اجنبی زبان بول رہا تھا۔احمد سن کر سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔سمجھنے پر آیا تو اس کی برداشت جواب دے گئی۔اسے کندھوں سے پکڑ کر خود سے بدقت علیحدہ کرتے ہوئے بولا،''ابھی بڑا کشٹ باقی ہے۔یہ تھینکنگ وینکنگ اس وقت کے لئے بچا رکھو جب تجھے کوئی خطرہ لاحق نہیں رہے گا۔''

وہ ممنونانہ انداز میں بولی،''نہیں احمد......میں نے اپنے خوف سے چھٹکارا پا لیا ہے۔''

احمد نے کوئی جواب نہیں دیا۔زمین پر بیٹھ کر جا گرز پہننے لگا۔ایسے میں سنبل نے کوٹ جھاڑ کر اس کے کندھوں پر رکھ دیا اور لائٹر ٹارچ اٹھا کر آف کر دی۔پھر کسی خیال کے تحت دوبارہ روشن کی۔گڑھے میں روشنی پھینکی۔محض دو تین فٹ تک خلا دکھائی دیا پھر سیاہی......اس نے جھرجھری لے کر ٹارچ بند کر دی۔چند ہی لمحوں میں احمد نے اسے چلنے کا کہا اور چٹان کے ساتھ گھسٹ کر چلنے لگا۔وہ اس کی تقلید کرنے لگی۔راستہ پہلے سے کہیں زیادہ دشوار ہو گیا تھا۔مستفسر ہوئی،''کیا تم پہلے بہت مرتبہ اس طرف آئے تھے؟''

''ہاں!پانچ سال سے پیشتر کی میری تمام عمر یہیں گزری تھی۔میں نے اس وادی کا چپا چپا چھان رکھا ہے۔تم فکر نہ کرو۔میں بھٹکنے والا نہیں ہوں۔''

''کیا میں بہت بھاری ہوں؟''اس نے اچانک پوچھا۔

''کیا مطلب؟''احمد چونک کر رک گیا۔

''تم نے تھوڑی دیر پہلے مجھے گندم کی بوری کہا تھا......وہ بہت بھاری ہوتی ہے۔شاید سو کلو گرام کی ہوتی ہے جبکہ میرا ویٹ پچپن کلو گرام ہے۔''

''میں نے درست کہا تھا۔یا شاید کافی دیر سے بھوکے پیٹ لڑ رہا ہوں،اس لیے تمہارا وزن بہت زیادہ محسوس ہوا۔''

''بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔میں نے کل صبح ناشتے میں ایک سوکھی روٹی کھائی تھی۔''

احمد نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔دو بٹر ٹافیاں نکالیں۔ایک اپنے منہ میں جبکہ دوسری سنبل کی ہتھیلی پر رکھ دی۔بولا،''میرے شولڈر بیگ میں بسکٹ بھی تھے۔اگر میں نے واپس جا کر بیگ اٹھا لیا ہوتا تو ہمارا سفر بہتر انداز میں جاری رہ سکتا تھا۔اگر تم اپنے اندر حوصلہ پاؤ تو یہیں رک جاؤ،میں بیگ اٹھا لاتا ہوں۔''

اس کی توقع کے عین مطابق سنبل نے سختی سے انکار کر دیا۔ وہ مسکرایا، بولا، ''چند منٹ رک جاتے ہیں۔ تھکن کم ہو جائے تو آگے چلیں گے۔ کافی دیر سے فائرنگ کی آواز سنائی نہیں دی۔ تمہارے طلب گار مایوس ہو کر واپس جانے والے تو ہیں نہیں، یقیناً جنگل کے کونے کھدرے چھان رہے ہوں گے۔ اب اگر وہ کھوکھے تک پہنچ بھی گئے تو ہمیں ڈھونڈ نہیں پائیں گے۔''

''ہمیں اور کتنا چلنا ہے؟'' سنبل نے ٹافی چوستے ہوئے پوچھا۔

''ابھی نصف سفر طے نہیں ہوا۔ موت کے گڑھے کی طرح ایک اور خطرناک مقام آنے والا ہے۔ اس کے بعد راستہ مزید دشوار تو ہو جائے گا مگر خطرناک نہیں رہے گا۔''

''مجھے دن میں یہاں سیکڑوں بندر دکھائی دیے تھے۔ رات میں کوئی ایک بھی نظر نہیں آ رہا۔ پربت شاہ نے کہا تھا کہ یہاں لیوپرڈز بھی رہتے ہیں۔ انسانوں پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔''

''اوہ نہیں یار...... اب ایسا بھی نہیں ہے۔ یہاں بھیڑیے ہوتے ہیں جو انسانوں سے دور بھاگتے ہیں۔ اگر میاں بیوی شکار پر اکٹھے نکلیں اور بہت بھوکے ہوں تو بچوں پر حملہ کرتے ہیں۔ اگر بچے کے ہاتھ میں کوئی شاخ یا چھڑی ہو تو پھر بھی نزدیک نہیں آتے۔ چیتے اور شیر یہاں کبھی دکھائی نہیں دیے۔'' احمد نے کہا۔

اچانک اسے بے تحاشا سردی اور سنبل کے ناکافی لباس کا خیال آیا۔ بولا، ''میرا خیال ہے کہ تم میرا کوٹ پہن لو۔ سردی نہیں لگے گی۔''

اس نے انکار کر دیا۔ بولی، ''تمہیں گرم رہنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ میں سردی میں خاصی حد تک عادی ہو گئی ہوں۔ بیمار پڑ گئی تو تم مجھے اٹھا کر وادی سے نکل سکتے ہو۔ اگر تم بیمار پڑ گئے تو میں یہاں سے زندہ نکل نہیں پاؤں گی۔''

احمد زیرِ لب مسکرایا۔ بولا، ''بہت مطلبی ہو۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ توقف کے بعد بولی، ''یہاں کوئی پھل دار پودے نہیں ہوتے؟''

اسے بھوک لگی تھی۔ احمد نے کہا، ''اس طرف کچھ نہیں ہے۔ البتہ جب ہم ندی پر پہنچیں گے تو چیری مل سکتی ہیں۔ بلکہ نہیں...... اس کا بھی موسم نہیں ہے۔''

''ندی میں پانی ہو گا؟''

''میرا خیال ہے کہ نہیں ہو گا۔'' احمد نے پر تیقن لہجہ اختیار کیا، ''البتہ ایک جگہ پر پینے کا پانی میسر آ جائے گا۔ کیا تم اتنی سردی میں بھی پیاس محسوس کر رہی ہو؟''

اس نے کہا، ''ہاں! پانی سے پیٹ تو بھرا جا سکتا ہے۔''

احمد نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اسے جی ہی جی میں پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے کھوکھے میں سے اپنا شولڈر بیگ کیوں نہیں اٹھایا تھا؟...... جب اسے یاد آیا تھا تو پلٹ کر اٹھا لیتا تو سنبل کو سردی سے خاصی حد تک بچا سکتا تھا۔ ایسے میں ایک پچھتاوا اور لاحق ہو گیا۔ اس نے نوری کے ساتھی کے کندھے سے رائفل اتاری تھی۔ اگر ذہن حاضر ناظر ہوتا تو اس کا کوٹ اور شوز بھی اتار سکتا تھا۔ اس سے دونوں مرتبہ جلد بازی میں بڑی غلطیاں سرزد ہو گئی تھیں۔ سر جھٹک کر عادتاً بڑبڑایا، ''نہیں یار! دو کے بعد تیسری غلطی پچھتانے کی کر رہا ہوں۔ پلٹ کر نہیں دیکھنا۔ آگے نظر رکھنا ہے۔''

سنبل چونکی، ''مجھ سے کچھ کہا؟''

وہ سنبھل گیا۔ بولا، ''نہیں...... میں اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ جب غصے، جوش یا مایوسی میں ہوتا ہوں تو خود سے مخاطب ہو جاتا ہوں۔''

''یہ تو مہلک نفسیاتی مرض ہے۔'' سنبل نے کہا۔

''مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس کے پیچھے میری زندگی بھر کی تنہائی کا عمل دخل ہے۔ جب دور ہوگی، یہ مرض بھی جاتا رہے گا۔''

''کیا مطلب؟ کیا تمہارے بہن بھائی اور ماں باپ نہیں ہیں؟'' سنبل کے لہجے میں ہمدردی اتر آئی۔

''ایسی بات نہیں ہے۔ میں ایک مکمل اور بھرپور گھرانے کا فرد ہوں۔ بہن، بھائی اور والدین کے علاوہ کئی رشتہ دار اور دوست ہیں۔ مگر میں نے ہوش سنبھالتے ہی خود کو مس فٹ محسوس کرتے ہوئے الگ کر لیا تھا۔ یعنی تم یہ کہہ سکتی ہو کہ میری قیدِ تنہائی خود ساختہ ہے۔'' احمد کا لہجہ اسپاٹ تھا۔

چلتے چلتے رک گیا۔ بولا، ''سنبل! اب ہم ندی کے عین اوپر کم و بیش چالیس فٹ کے فاصلے پر کھڑے ہیں۔ آگے راستہ نہیں ہے۔ عمودی چٹان سر اٹھائے کھڑی ہے۔ بائیں پہلو میں بھی ایک ایسی ہی چٹان واقع ہے جس کے اوپر ہم اس وقت کھڑے ہیں۔ ہمیں یہاں سے پھسل کر نیچے اترنا ہے۔''

سنبل نہ سمجھ پائی، بولی، ''پھسل کر...... کیا مطلب؟''

اس نے اپنی باڈی لینگوئج سے اسے پھسلنے کے عمل کی وضاحت کی۔ وہ سمجھ گئی۔ بولی، ''تو اس میں مشکل کیا ہے؟''

''نیچے ندی کا پیٹ ہے۔ کہیں ریت ہے تو کہیں پتھر...... اگر ہم کسی نوکیلے پتھر پر گرے تو اٹھنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ فاصلہ اتنا ہے کہ لائٹر ٹارچ کی روشنی میں ندی دکھائی نہیں دے گی۔''

سنبل نے کچھ نہیں کہا۔اسے سوچنے کا موقع دیا۔وہ بڑبڑایا،''کاش!اس چٹان پر کہیں نشان لگا دیا ہوتا......''

''کیسا نشان؟''سنبل استعجاب آمیز لہجے میں بولی۔

''اوہ......میرا مطلب ہے کہ جب ہم یہاں سے پھسلا کرتے تھے،تب ہمیں چاہیے تھا کہ اس چٹان پر کوئی نشان لگا دیتے جہاں سے پھسل کر ہم ریت پر گر سکیں......مگر یہ تو بہت پرانی بات ہے......''احمد نے کہا۔پھر سنبل کی طرف منہ کیا اور پیروں کے بل بیٹھ گیا۔پشت پر خلا،دونوں پاؤں چٹان کی آخری سطح پر اور ہاتھ چٹان پر چپکے ہوئے......وہ یہ عمل بڑی آہستگی سے کر رہا تھا اور سنبل کو دکھا رہا تھا کیونکہ اسے احمد کے بعد عین اسی انداز میں نیچے گرنا تھا،''یہیں سے کودنا،میں تمہارے استقبال کے لیے نیچے کھڑا ہوں گا۔ڈرنا نہیں......میں ہوں ناں......''

''احمد......اچھی طرح دیکھ لو،کہیں تم پتھروں پر ہی نہ جا گرو۔''سنبل پر تشویش کا گہرا تاثر غالب تھا۔

احمد مسکرایا پھر سیٹی بجا کر نیچے پھسل گیا۔سرر......سرر......کی نامانوس سی آواز فضا کے اندھیرے میں ابھری پھر معدوم ہو گئی۔سنبل نے لامحدود خلا میں جھانک کر احمد کو دیکھنے کی کوشش کی۔وہ دکھائی نہیں دیا۔دبے دبے لہجے میں مستفسر ہوئی،''احمد......تم ٹھیک تو ہو ناں؟''

کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔سمجھ میں آیا کہ اس کی آواز احمد تک پہنچی نہیں ہو گی۔بلند آواز میں پوچھنا چاہتی تھی مگر احتیاط مانع ہوئی کہ احمد کے علاوہ بھی کوئی سن سکتا تھا۔چند لمحے پریشانی میں گزرے۔پھر احمد کی مدھم سی آواز کانوں میں اتری۔اس نے کیا کہا تھا،سمجھ نہ پائی مگر جو دل سننا چاہ رہا تھا،وہ سن چکا تھا۔وہ خیریت سے تھا۔اس نے احمد کی سی پوزیشن لی۔چٹان پر سینے کے بل لیٹ گئی اور ہاتھوں کی گرفت پتھر سے اٹھا لی۔ایسے میں پتہ چلا کہ احمد کتنے بڑے عذاب سے گزر کر نیچے پہنچا تھا۔چٹان کی سطح گیلی تھی اور وہ برف کے مانند سرد تھی۔بدن میں جھرجھری پیدا ہوئی۔وہ پھسلتی ہوئی غیر معمولی تیزی سے نیچے جا رہی تھی۔کہیں کہیں پتھر کی سطح کھردری تھی جس نے ٹی شرٹ پھاڑ دی تھی۔ایک ہی وقت میں جسم میں چٹان کی خنکی اور رگڑ کی آگ بھر گئی۔خوف کی پھریری نے اوسان خطا کر دیے مگر ان کیفیات کا دورانیہ بہت مختصر تھا۔زمین سے پہلے احمد کی بانہوں کے لمس سے آشنا ہوئی۔وہ اسے سنبھالنے کے لیے کھڑا تھا مگر اس نے سنبھال نہ پاتے ہوئے بھی سنبل کو زمین پر گرنے نہیں دیا۔دونوں اوپر نیچے ریت پر گرے۔خوف کے مارے سنبل کی سانس سینے میں اٹکی ہوئی تھی۔چند لمحے ایسے ہی گزر گئے۔سانس بحال نہ ہوئی۔ایسے میں سمجھ آئی کہ سانس رکنے کا سبب اور تھا۔احمد کی بانہوں کا شکنجہ بہت سخت تھا۔

وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی،''احمد......ہاتھ نرم کرو۔''

احمد بری طرح چونکا۔ شرمسار ہوا اور بانہیں کھولتے ہوئے بولا، ’’نہیں یار! پھر غلط ہو گیا ناں..... سوری سنبل! مجھے اس کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔‘‘

وہ ریت پر ہاتھ ٹکا کر کھڑی ہوئی۔ جب اس پر لیٹی تھی تو دور تھی۔ جب دور ہوئی تو زیادہ قریب آنے لگی۔ زندگی ایسے ہی کھیل کھیلنے کی رسیا ہوتی ہے۔ احمد چاروں شانے چت لیٹا لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا۔ وہ اس کے پہلو میں گھٹنوں کے بل بیٹھی اس کے دھندلے نقوش کو گھورتی رہی۔ ایسے میں سردی کا احساس بیدار ہوا۔ سینے پر ہاتھ پھیرا۔ ٹی شرٹ میں کئی چھوٹے بڑے سوراخ ہو گئے تھے جہاں سے گزر کر یخ بستہ ہوا بدن پر ضربیں لگا رہی تھی۔ اس نے سینہ بازوؤں سے ڈھانپ لیا۔

ناگاہ اس طرف دیکھا جہاں چند لمحے پہلے وہ کھڑی تھی۔ گردن گھمائی۔ ہر طرف اندھیرے کا راج تھا۔ احمد نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ کچھ سوچ رہا تھا یا بہت زیادہ تھک گیا تھا۔ پوچھنے لگی، ’’احمد! کیا بات ہے؟ کیا تمہیں کوئی چوٹ لگی ہے؟‘‘

اس نے کہا، ’’ہاں! مگر بری نہیں۔‘‘

’’بری نہیں..... کیا مطلب؟‘‘ وہ بری طرح چونک گئی۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ بولا، ’’ہر بات ایسی نہیں ہوتی کہ اس سے کوئی مطلب بھی نکلتا ہو۔ اٹھو! ابھی ہمیں اور چلنا ہے۔‘‘

دونوں ایک ساتھ کھڑے ہوئے۔ اب ان کا رخ جنوب کی جانب تھا۔ ندی کا پانی اسی رخ چلتا تھا۔ احمد کا اندازہ ٹھیک تھا۔ ندی میں پانی نہیں تھا۔ سنبل نے پوچھا، ’’اس ندی میں پانی کیوں نہیں ہے؟‘‘

وہ بولا، ’’یہ برساتی نالہ ہے۔ سندر بن میں بارش ہوتی ہے تو اس کا پیٹ بھر جاتا ہے ورنہ راستہ سا بن جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ بارش ہونے والی ہے۔ اب تب میں، کسی بھی وقت بارش ہو سکتی ہے۔ بارش کے نصف گھنٹہ بعد یہ ندی پانی سے بھر جائے گی اور جہاں ہم چل رہے ہیں، یہاں شور کرنے والا پانی بھاگنے لگے گا۔‘‘

سنبل گھبرا گئی۔ بدقت سردی کا سامنا کر رہی تھی۔ بارش ہونے کی وجہ سے سردی بڑھ جاتی تو وہ دو قدم بھی چلنے کے قابل نہ رہتی۔ بولی، ’’اف میرے خدا! یہ سردی جھیلی نہیں جاتی، وہ کیسے جھیل پاؤں گی۔‘‘

احمد رک گیا۔ اپنا کوٹ اتارنے لگا۔ سنبل روکتی رہی مگر اس نے چند سیکنڈز میں اسے کوٹ اوڑھا دیا۔ کوٹ کا اندرونی ماحول بہت گرم تھا۔ احمد کے بدن کی گرمی نے چند لمحوں میں سنبل کو گرما دیا۔ احمد بولا، ’’کیسا رہا؟‘‘

سنبل کچھ نہ بول پائی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ کوٹ اترتے ہی احمد کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ وہ چند منٹوں میں کانپنے لگا۔ چونکہ سنبل رات بھر میں سردی جھیلنے کی عادی ہو گئی تھی، اس لیے احمد سے بہتر انداز میں جھیل رہی تھی۔ وہ کوٹ میں تھا۔ گرم تھا۔ اب اچانک

سرد ہو کر ناکارہ ہونے لگا تھا مگر پتھروں میں پیدا ہونے والے کی ضد بھی پتھریلی تھی۔ مزاج بھی سنگیں تھا۔ اس نے خود کو گرم کرنے کیلئے اپنی رفتار تیز کر لی۔ سنبل کے لئے بھاری بھرکم کوٹ میں چلنا دوبھر ہو گیا۔ ایسے تیسے ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے ہو گیا۔ اس دوران دونوں کے درمیان اندھیرے سے بھی کہیں گہری خاموشی حائل رہی۔

ندی کا راستہ بتاتا تھا کہ وہ جب چلتی تھی تو گام گام لہرا کر چلتی تھی۔ وہ بھی زگ زیگ چلتے ہوئے ایک تنگ سے درے میں آ کر رک گئے۔ ایسے میں ننھی ننھی پھوار گرنے لگی تھی۔ سنبل بولی، ''مجھ سے تو اب چلا بھی نہیں جا رہا۔''

یہی حالت احمد کی تھی مگر وہ اپنی کمزوری کا اظہار کرنے والا نہیں تھا۔ بولا، ''اب ہم ایک عارضی پڑاؤ پر پہنچ چکے ہیں۔ یہاں ایک کھوہ ہے جس میں ہم رات کا بقیہ وقت محفوظ رہتے ہوئے گزار سکتے ہیں۔ کیا ہمیں ایسا کرنا چاہیے؟''

وہ جلدی سے بولی، ''ضرور...... میں بہت تھک گئی ہوں۔ پانی مل جائے گا کیا؟''

احمد کے لبوں سے بے ساختہ نکلا، ''ہاں...... نہیں...... یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مگر فکر نہ کرو۔ ابھی بارش ہونے والی ہے۔ پانی کی ریل پیل ہو جائے گی۔ جی بھر کر پی لینا۔''

اسے پیاس نہیں لگ رہی تھی۔ سوچ رہا تھا کہ سنبل کا حلق کیوں سوکھ رہا ہے۔ پھر خیال آیا کہ اس کی حالت احمد سے کہیں دگرگوں تھی۔ وہ لڑکی تھی اور گزشتہ رات بھر سے دوڑ بھاگ کر رہی تھی۔ سردی کے مارے بے ہوش ہونے تک نہ جانے سفر کے کن مراحل سے گزری تھی۔

احمد نے ندی کے بائیں کنارے کا قصد کیا۔ ایک تنگ جگہ پر پہنچ کر اونچے نیچے پتھروں پر چڑھ گیا۔ سہارا دے کر سنبل کو بھی چڑھایا۔ دس بارہ گز کی بلندی تک پہنچنا نہایت مشکل کام تھا۔ وہ پتھروں کا مزاج آشنا تھا۔ سنبل ناشناسا تھی۔ اسے سہارا دینے کے نام پر اسے اٹھانا پڑتا تھا۔ منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی بری طرح ہانپنے لگا۔

کہنے لگا، ''نہیں یار! ابھی تو یہ بھوکی ہے، او کھے سوکھے اٹھا لیتے ہو۔ پیٹ بھر کر کھائے گی تو کرین منگوانا پڑے گی۔''

وہ جھینپ گئی مگر اس کی خود کلامی میں حائل نہیں ہوئی۔ چند لمحوں بعد ایک کھوہ کے سامنے پہنچ گئے۔ دو اڑھائی فٹ قطر دہانے والی یہ کھوہ علاقے سے ناواقف شخص کو ہرگز دکھائی نہیں دے سکتی تھی۔ اس کے عین سامنے، دو تین فٹ کے فاصلے پر ایک بڑا پتھر جبکہ دائیں ہاتھ پر پائن کا قدآور درخت ایستادہ تھا۔ احمد درخت کی جڑ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ہاتھ کھوہ میں ڈال کر لائٹر ٹارچ روشن کی۔ کافی دور تک منظر کھل گیا۔ وہ ڈیڑھ دو فٹ کے بعد تنگ سے کمرے کا روپ دھارتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کیا۔ سنبل کی پینٹ کا پائنچہ پکڑ کر نیچے کھینچا۔ یہ بیٹھ جانے کا حکم تھا۔ وہ بولا، ''میں اندر جا رہا ہوں۔ آواز دوں گا تو گھٹنوں کے بل چل کر اندر آ جانا۔ شاہِ عالم کا

دربار سجا ہوگا۔‘‘

اسے احمد پر حیرانی ہوئی۔ اتنے سخت اعصاب کا مالک اسی دنیا میں رہ رہا تھا۔’او کے‘ کہہ کر پتھر اور درخت کے درمیان پھنس کر بیٹھ گئی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے احمد گھٹنوں کے بل چلتا ہوا کھوہ میں غائب ہو گیا۔ وہ آنکھیں جھپکائے بغیر کھوہ کے اندر دیکھتی رہی۔ احمد کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ اس نے غار کی کمرہ نما جگہ کا معائنہ کیا۔ اس دوران دائیں ہاتھ جا کر سنبل کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ چند لمحوں بعد قدرے گونجتی ہوئی آواز سنائی دی، ’’سنبل! آجاؤ......اندر آجاؤ۔‘‘

وہ گھٹنوں کے بل چلنے لگی۔ کوٹ کی وجہ سے خاصی مشکل پیش آئی۔ گھٹنے پتھر کی وجہ سے دُکھنے لگے۔ منٹ بھر بعد وہ اندھیرے سے نکل کر لائٹر ٹارچ کی روشنی سے منور غار میں تھی جہاں وہ جھک کر کھڑی ہو سکتی تھی مگر وہ کھڑی نہیں ہوئی تھی بلکہ غار کی شمالی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے احمد کے پاس گھٹنوں کے بل چل کر پہنچی۔ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ سانسیں ہموار کر کے بولی، ’’یہ تو ہینڈ میڈ کمرہ لگتا ہے۔‘‘

احمد نے نفی میں سر ہلایا، ’’نہیں...... یہ قدرتی کھوہ ہے۔ ایسی ان گنت بڑی چھوٹی غاریں اس وادی میں موجود ہیں۔ اس غار کے بارے چند ایک لوگ ہی جانتے ہوں گے۔‘‘

وہ بولی، ’’مجھے زور کی پیاس لگی ہے۔‘‘

اس نے کندھے اچکائے، ’’میں دم لے لوں، پھر کچھ کرتا ہوں۔‘‘

اس نے اپنی جیب ٹٹولی، پھر سنبل کے بدن پر موجود اپنے کوٹ کی جیبیں ٹٹولیں۔ مایوسی چہرے پر ثبت ہو گئی۔ سنبل نے پوچھا، ’’اب کیا ہوا؟‘‘

’’موبائل فون گر گیا ہے کہیں......نوری سے مارا ماری کے دوران جھاڑی میں گر گیا یا اس کے ساتھی سے میل ملاقات کے دوران......خیر، وہ اس وادی میں محض گھڑی کا کام ہی تو دے رہا تھا۔ میں وقت دیکھنا چاہتا تھا۔‘‘

’’تین یا چار بجے ہوں گے۔‘‘

’’اگر موبائل ہوتا تو ’یا‘ نہ کہنا پڑتا۔‘‘ احمد نے کہا۔ ایسے میں سنبل نے اس کی آواز کی لرزش کو محسوس کیا۔ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ کپکپاہٹ محسوس ہوئی۔ اپنی خود غرضی پر دل نے ملامت کیا۔ بولی، ’’تم نے بتایا ہی نہیں کہ تمہیں اتنی سردی لگ رہی ہے۔‘‘

وہ اپنا سر عقبی دیوار سے ٹکا کر، آنکھیں موند کر، سستی آمیز لہجے میں بولا، ’’تم میرا فکر نہ کرو۔ یہ جگہ نسبتاً گرم ہے۔ کچھ ہی دیر میں سردی کا احساس بہت کم ہو جائے گا۔ میں خاصا تھک گیا ہوں۔ تم اگر مجھ پر کرم کرو تو مجھے آرام کرنے دو کیونکہ ہمیں دو چار گھنٹے یہیں گزارنے

پڑیں گے۔‘‘

سنبل کو اس کی بات ناگوار گزری مگر وہ اس کا اظہار کرنے کی حیثیت میں نہیں تھی۔ سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ دس پندرہ منٹ بعد اس نے سر اٹھایا۔ احمد کی طرف دیکھا۔ وہ یقینی طور پر سو گیا تھا۔ اس کے ننھے ننھے خراٹے اور ڈھیلا ڈھالا بدن اس کی گہری خوابیدگی کی دلیل تھے۔ اس کے چہرے پر اس کے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کی روشنی پڑ رہی تھی۔ پہلی مرتبہ اس کے خطوط نظر آ رہے تھے۔ ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ وہ جواں سال تھا۔ رنگت قدرے سنولائی ہوئی، خمدار گھنی مونچھیں، دراز اور چست قامت، سیاہ گھنگھریالے بال جو خاصے لمبے تھے اور بڑھی ہوئی شیو...... وہ جاذبِ نظر مرد تھا۔ کسی بھی چشمِ اغنا کو گرہ دے سکتا تھا۔ سانس کے بل پر اٹھتا بیٹھتا چوڑا سینہ، مضبوط بازو...... اور اس کے چہرے پر پیاس بھری معصومیت کے عکس...... بالکل بھی محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ اپنے سے دگنی جسامت والے تین ہٹے کٹے گن برداروں کو ٹھکانے لگا کر لیٹا تھا۔ مگر سنبل یہ کارگزاری اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔

اس نے آہستگی سے اس کے ہاتھ سے ٹارچ لی۔ غار کا بہ نظرِ غور جائزہ لیا۔ وہ کشادہ نہیں تھی مگر ان دونوں کو پناہ دینے والی وسعت رکھتی تھی۔ فرش، دیواریں اور چھت مختلف سیاہ پتھروں کی تھیں۔ ایک دیوار کی جڑ میں گھاس اگی ہوئی تھی۔ وہاں یقیناً مٹی تھی۔ نچلی اور اوپر والی چٹانوں میں ساڑھے چار پانچ فٹ کا فاصلہ حائل تھا اور یہی کمرے کی بلندی تھی۔ چند مختلف سائزوں کے ننھے پتھروں کے سوا ناہموار فرش پر کچھ نہیں تھا۔ اسے احمد کے انتخاب پر اطمینان تھا کہ اس خفیہ غار تک کوئی پہنچ نہیں پائے گا۔

سنبل کو وہاں سردی نہیں لگ رہی تھی۔ گیلی جرابیں اتار کر ایک طرف پھینک دیں۔ پاؤں گیلے تھے مگر یخ نہیں تھے۔ ایسے میں باہر ناشناسا شور برپا ہو گیا۔ وہ سہم گئی۔ مبادا اس کو تلاش کرنے والے غار تک پہنچ گئے ہیں۔ شور آن کی آن میں بڑھ تو اس نے احمد کو جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ وہ ہڑبڑا گیا۔ ’’کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟‘‘

’’وہ...... ادھر شور سن رہے ہو؟‘‘ اس کی آواز مرتعش تھی۔

احمد نے کان لگائے۔ شور سنا۔ منہ بنا کر بولا ’’بارش ہو رہی ہے۔ اتنا بھی پتہ نہیں چلتا تمہیں...... میں سنڈرلینڈ سے آئی ہوں!‘‘

اس نے نقل اتارتے ہوئے سنبل کا جملہ دہرایا اور ایک غصہ بھری نگاہ ڈال کر پھر سو گیا۔ سنبل کو خفت ہوئی۔ سوچنے لگی کہ اس نے جلد بازی کا مظاہرہ کیا تھا ورنہ اسے چاہیے تھا کہ دہانے کے باہر جھانک کر دیکھ لیتی۔ اس شور کے ساتھ ہی سردی کا تاثر بھی کمزور ہو گیا۔

بارش گھنٹہ بھر جاری رہی۔ اس دوران احمد سویا رہا جبکہ سنبل جاگتی رہی۔ کبھی ٹارچ آن کر کے اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگتی تو کبھی آنکھیں بند کر کے اپنی سوچوں میں غلطاں ہو جاتی۔ پیاس کے مارے اس کا برا حال تھا مگر کھوہ سے باہر جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ پربت شاہ کے آدمیوں کا خوف ذہن پر غالب تھا۔ یہ اندازہ بھی تھا کہ جن پتھروں پر چڑھ کر یہاں پہنچی تھی، احمد کے سہارے

کے بغیر ان پر سے اتر نہیں سکے گی۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتی رہی۔

خاموشی نے بارش تھمنے کی خبر دی مگر تاریکی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ احمد بیدار ہو جائے اور اس کے ساتھ باتیں کرے مگر اس کی ناراضی کے ڈر سے جگا نہیں رہی تھی۔ ایسے میں اس کے دل کی آواز گویا احمد نے سن لی۔ بیدار ہو گیا۔ بولا، ''سنبل! کیا تم بھی سو گئی ہو؟''

وہ جلدی سے بولی، ''نہیں...... مجھے نیند نہیں آئی۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے ٹارچ جلا کر اس کے چہرے کے رخ کر دی۔ خوابیدہ اور بیدار چہرے میں آنکھوں نے فرق حائل کر دیا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ٹارچ کی ننھی سی بیم پر جمی ہوئی تھیں۔ دونوں بازوؤں کو سینے پر پھیلا کر، انگڑائی کے انداز میں اکڑاتے ہوئے بولا، ''تم مجھ سے زیادہ سخت جان ہو۔ تمہیں بخار ہوتے ہوتے نہیں ہوا جبکہ مجھے بخار ہو گیا ہے۔''

وہ چونکی۔ گھبرا کر اس کے قریب کھسکی۔ کلائی تھام کر بخار کی شدت کا اندازہ کرنا چاہا مگر ہاتھ میں پہنا ہوا دستانہ رکاوٹ بن گیا۔ جھینپ کر دستانہ اتارا۔ کلائی تھامی۔ ٹمپریچر زیادہ تھا۔ بولی، ''اب کیا ہو گا؟ یہاں تو کوئی میڈیسن ہی نہیں ہے۔''

وہ مسکرایا۔ بولا، ''ٹارچ ہٹاؤ۔ میں باہر جھانک آؤں۔''

سنبل نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے سے روکا۔ جلدی سے کوٹ اتارا۔ اسے پہننے کے لیے دیا۔ بولی، ''تمہیں اس کی زیادہ ضرورت ہے۔''

وہ ہتھیلیوں کے بل تھوڑا آگے کی طرف کھسکا اور بغیر کچھ کہے کوٹ پہن لیا۔ بٹن بند کرنے کے بعد اس نے ٹارچ سنبل کے ہاتھ سے لی۔ ایسے میں ٹارچ کا رخ سنبل کی طرف ہو گیا۔ روشنی کے عقب میں سنبل کی طرف پیش قدمی کرنے والی آنکھوں کو ایک جھٹکا لگا۔ سنبل نے احمد کی نظروں کے تعاقب میں اپنے سینے کی طرف دیکھا۔ پورے بدن کا لہو آن واحد میں چہرے پر اکٹھا ہو گیا۔ اسے کوٹ اتارتے ہوئے پھسلنے سے کئی جگہوں پر سے گھس جانے والی ٹی شرٹ بھول گئی تھی۔ اب سن سی بیٹھی اپنا آپ دیکھنے لگی۔ احمد کو خود پر قابو پانے میں چند ساعتیں لگیں۔ ٹارچ کا رخ پھیر کر بولا، ''کوٹ اتارنے کی کیا ضرورت تھی۔''

وہ جواب میں کچھ نہ کہہ سکی۔

احمد گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے دہانے کی طرف بڑھا۔ دہانے کی طرف مڑنے کے بجائے رک گیا۔ بولا، ''ادھر آؤ...... تمہارے لیے قدرت نے تھوڑا سا پانی جمع کر دیا ہے۔ پی لو۔''

بارش کا پانی کھوہ میں بھی داخل ہوا تھا۔ دہانے کے سامنے والی ٹکڑ میں کوئی سوراخ تھا جس کی وجہ سے کھوہ میں مجتمع ہونے کے بجائے

کہیں اور چلا گیا تھا۔فرش پر ایک پیالہ نما گڑھا موجود تھا جو پانی سے لبالب تھا۔احمد نے اس پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔پہلو کو چھوتی ہوئی سنبل سے مخاطب ہوا،''اگر چاہو تو براہِ راست منہ لگا لو اور اگر ایسے پانی پینا برا لگے تو ایک ہاتھ کا چلو بنا کر پی لو۔بہر حال!یہ تمہارا دردِ سر ہے۔''

اس نے روشنی گڑھے پر مرکوز رکھی۔سنبل نے خاک آلود پانی کا چلو بھرا۔ہونٹوں سے لگایا۔پہلے ہاتھ برف ہوئے پھر منہ،پھر یخ بستہ پانی معدے تک جاتا ہوا محسوس ہوا۔اس نے تین چار چلو پانی معدے میں اتارا۔سیر ہو کر بولی،''شکریہ احمد!اگر مجھے اس گڑھے کا علم ہوتا تو اب تک پیاس کا عذاب نہ بھگتتی۔''

احمد دہانے کی طرف بڑھتے ہوئے تھم گیا۔گیلری نما حصہ پانی سے بھرا ہوا تھا۔ایسے میں سرد ہوا کا ایک جھونکا دہانے میں داخل ہوا۔اس پر یک آن کپکپی طاری ہو گئی۔پلٹ کر ننھے سے پانی کے گڑھے کی طرف بڑھا۔آدھا پانی سنبل نے پیا تھا۔بقیہ آدھے پانی سے اس نے وضو کیا اور چوپاؤں کی طرح چلتا ہوا شالی دیوار تک چلا آیا۔سنبل نے اس کی تقلید کی۔دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

احمد روشن ٹارچ کو پہلو میں رکھ کر دوزانو بیٹھ گیا۔وہ خدا کی بارگاہ میں حاضر تھا۔اگر غار میں کھڑے ہونے کی جگہ ہوتی تو کھڑا ہو کر نماز ادا کرتا۔اب مجبوری تھی۔نماز سے فارغ ہوا تو اس نے ٹارچ آف کر دی۔اندھیرے میں پہلی سی سنجیدگی نہیں رہی تھی۔شاید صبح ہونے والی تھی یا ہو چکی تھی۔

سنبل نے پوچھا،''احمد!تم نماز کیوں پڑھتے ہو؟''

وہ چونکا،بولا،''کیا تم مسلمان نہیں ہو؟''

''آں......ہاں......تم میرے سوال کا جواب دو۔''

''نماز برائی سے روکتی ہے۔برے خیالوں سے دور رکھتی ہے۔''

''ایسا کیا برا خیال تمہارے ذہن میں آیا تھا کہ تم نماز پڑھنے لگے۔''

احمد نے غور کیا۔وہ طنز نہیں کر رہی تھی۔بڑبڑایا،''اوہ یار!یہ بے چاری انگلینڈ میں پلی بڑھی ہے۔اسے اسلام اور نماز کے بارے میں کیا علم ہوگا۔''

بولا،''میں اس سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا۔چھوڑو اس موضوع کو،یہ تمہاری سمجھ میں آنے والا نہیں ہے۔تم یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟......ابھی تک مجھے تم سے پوچھنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ تم کن حالات سے گزر کر مجھ تک پہنچی ہو۔اگر مناسب سمجھو تو بتا دو۔''

سنبل نے دریافت کیا،''اگر میں تمہارے اس سوال کا جواب نہ دینا چاہوں تو؟''

وہ چونکا۔ سنبل کی طرف دیکھا، کوئی نتیجہ اخذ کر کے بولا، ”تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”کیوں؟“ سنبل کی آواز میں حیرانی کا عنصر گھل گیا، ”تم میرے لئے جان خطرے میں ڈال چکے ہو، پھر بھی تمہیں اس پر اعتراض نہیں ہوگا کہ میں تم پر اعتبار نہیں کرتی۔“

اس نے کندھے اچکائے، بے نیازی سے بولا، ”میں نے ایک انسان کو، خاص طور پر ایک بے دست و پا، مرتی ہوئی لڑکی کو زندگی کی ڈگر پر لانے کی کوشش کی ہے۔ ابھی میرا کام باقی ہے۔ تمہیں اس علاقے سے نکال کر اسلام آباد پہنچاؤں گا...... پھر تجھے گڈ بائی کہہ کر اپنے گاؤں سندر بن میں لوٹ آؤں گا۔ پھر تم ہی بتاؤ کہ مجھے تمہارے حالات سے کیا لینا دینا...... تم مجھے کچھ بتاؤ، بھلے کچھ بھی نہ بتاؤ، میرے نزدیک کوئی فائدہ یا نقصان نہیں ہے۔“

وہ عجیب نہیں، عجیب تر تھا۔ کئی ساعتیں عکس کی طرح نظر آنے والے اس سانولے مرد کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی۔ اس کی زندگی میں ایسا کوئی مرد نہیں آیا تھا۔ بولی، ”تم طبعاً اتنے لاپروا ہو یا کسی مقصد کے تحت خود کو بے لوث ثابت کرنا چاہ رہے ہو؟“

بات چبھتی ہوئی تھی تبھی چبھ گئی۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ تعجب سے بولا، ”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“

”میں جو کہنا چاہتی تھی، کہہ چکی ہوں۔ اگر تم اس کا جواب دینا چاہو تو تمہاری مرضی...... تم میرے پابند نہیں ہو۔“

”یعنی مجھے تم سے کوئی لالچ ہو سکتا ہے؟“ اس کی حیرانی ابھی تک گئی نہیں تھی۔ تبھی پوچھ رہا تھا، ”تم خوب صورت ہو۔ جوان ہو۔ یقینی طور پر غیر شادی شدہ بھی ہو۔ کچھ ایسی ہی حالت میری بھی ہے۔ تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں تم سے...... آ...... تم سے محبت کرنے لگا ہوں اور تمہیں اپنی بیوی بنانا چاہتا ہوں۔“

ایک ہی وقت میں اس کے لہجے میں تعجب بھی تھا اور خفگی بھی...... سنبل پر گویا اس کے جملوں کا طنز نہیں پہنچا۔ بولی، ”ہو سکتا ہے کہ ایسا ہی ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ اس سے بھی زیادہ گھمبیر ہو......“

وہ کئی ثانیے اسے ایک ٹک دیکھے گیا۔ پھر مایوسی سے بولا، ”اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہاری وہ دولت جو ابھی تک دکھائی نہیں دی، مجھے اس مارا ماری پر اکسا رہی ہو اور میں تمہیں اور اس دولت کو حاصل کرنے کے لئے اپنی جان ہتھیلی پر رکھے تمہیں وادی سے نکالنے جا رہا ہوں۔ ہیں؟“

اس نے کچھ سوچا، احمد کو دیکھا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ شبہ ہوا کہ اندھیرے کی وجہ سے سر کی اثباتی حرکت احمد نے نہ دیکھی ہو تبھی بولی، ”ہاں! یہ بھی بعید از امکان نہیں۔“

احمد بھونچکا رہ گیا۔ ایک ٹک خاموشی سے اسے دیکھے گیا مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔ سنبل نے ترغیب دی، ”تم خاموش ہو گئے ہو۔“

وہ بولا،''مجھے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا۔''

سنبل نے اسے بہتیرے کچوکے دیئے مگر وہ خاموش رہا۔دل میں ابھرتے ہوئے طوفانوں کو دبائے بیٹھا رہا۔

وہ بولی،''یہ تو طے ہوگیا ہے کہ تم میری سٹوری سننے میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے مگر میں سوچتی ہوں کہ تم میرے حالات کو بخوبی جاننے کے بعد ہی تم بہتر انداز میں میری مدد کر سکتے ہو۔''

وہ کچھ نہیں بولا۔سنبل کو اس کی آزردگی کا احساس ہوا۔قریب ہوئی۔اس کی پنڈلی تھام کر بولی،''سوری احمد! میں نے جو کہا، غلط کہا، تم یقیناً ایسے ہرگز نہیں ہو۔''

وہ خفا نہیں تھا۔دل گرفتہ تھا۔اس کی ذات پر اُس مظلوم لڑکی نے شک کا دائرہ کھینچا تھا جسے اس نے بڑی تگ ودو کے بعد بولنے کے قابل کیا تھا۔اس نے سنبل کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔سرد اور بے جان سا ہاتھ...... بولا،''سنبل! میں کون ہوں، کیا ہوں اور کیا چاہتا ہوں...... یہ بتانے کی مجھے ضرورت نہیں اور نہ ہی مجھے تمہارے بارے جاننے کا شوق ہے۔صبح ہو رہی ہے۔تمہیں اس کھوہ سے نکال کر سڑک کی طرف جاؤں گا۔کسی گاڑی کا بندوبست کر کے اسلام آباد روانہ کردوں گا اور بس......تم اپنے گھر پہنچ کر میرے بارے میں انہی شکوک کی خودکلامیاں کرنا۔اب خاموش ہو جاؤ۔مجھے تمہاری کوئی بات اچھی نہیں لگے گی اور تمہیں خواہ مخواہ مایوسی ہوگی۔''

اس نے اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھا دیا۔لجاجت سے بولی،''پلیز احمد! تم کچھ دیر پہلے ایسے تو نہیں تھے۔''

''یس...... پہلے میں نے تمہارے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں سوچی تھی۔اب سوچ رہا ہوں اور اپنی نظروں میں گر رہا ہوں۔''

''تم نے ایسا کچھ کیا تو نہیں۔''

''ہاں! مگر تم نے بہت کچھ سوچ لیا۔''

''مجھے معاف کردو احمد...... مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''ڈرومت۔تمہاری مدد تو میں کر ہی رہا ہوں۔''

''مگر تمہیں ابھی بہت دور تک میرے ساتھ چلنا ہوگا۔میرے سفری کاغذات پربت شاہ کے پاس ہیں۔پاسپورٹ، ریٹرن ٹکٹ، آئی ڈی......سب کچھ......اور میرے پاس ایک پونڈ بھی نہیں ہے۔تم مجھے اسلام آباد بھیج دو گے تو میں وہاں جا کر کیا کروں گی۔میرا کوئی واقف کار وہاں نہیں بلکہ اس ملک میں سرے سے میں کسی کو جانتی تک نہیں ہوں۔''اس کا گلا رُندھ گیا۔ابھی چیخ کر بول رہی تھی۔ابھی گلوگیر ہو رہی تھی۔

اس نے احمد کی پنڈلی چھوڑ دی۔ہاتھ پکڑ لیے۔یہی نہیں، دونوں ہاتھ اپنے گالوں سے لگا لیے۔گھٹے گھٹے لہجے میں بولی،''تمہارا

خیال ہے کہ اس کھوہ سے نکلتے ہی میں آزاد ہو جاؤں گی اور مجھے کوئی خطرہ لاحق نہیں رہے گا مگر سچ یہ ہے کہ میں ہوائی جہاز میں بیٹھنے تک ڈرتی رہوں گی۔ کسی بھی وقت پربت شاہ کے غنڈے مجھ تک پہنچ جائیں گے۔ وہ مجھے ویٹنگ لاؤنج سے بھی نکال لائیں گے۔ میں اس ملک پر مسلط لاقانونیت دیکھ چکی ہوں۔ خدا کے لئے مجھے اکیلا مت چھوڑو۔ تمہارے علاوہ مجھے کوئی مددگار نہیں ملے گا۔ پلیز......"

اس نے ہچکیاں لینا شروع کر دیں۔ احمد بولا، "تم احمق لڑکی ہو۔ ایک طرف مجھ پر شک کرتی ہو، بے اعتباری کا اظہار بھی کرتی ہو جبکہ دوسری طرف میری خاموشی پر رونے دھونے لگتی ہو۔ کیا ہو تم؟ میں تمہیں کیوں سمجھ نہیں پا رہا۔ اوکے......تم یہ ڈرامہ بازی بند کرو اور اپنے بارے بتاؤ۔ یہ بھی واضح کرو کہ میں تمہارے لئے مزید کیا کر سکتا ہوں۔"

سنبل نے کھلونا گڑیا کی طرح اچانک رونا بند کر دیا۔ اس کے ہاتھ چھوڑ کر، آنکھیں پونچھ کر سیدھی ہو بیٹھی، بولی، "دیٹس گڈ...... میں تمہیں بتاتی ہوں کہ میں یہاں کیا لینے آئی تھی۔"

❀❀❀

اس کی کہانی کئی سال پیشتر سندربن سے شروع ہوتی تھی۔

وہ پربت شاہ کے چھوٹے بھائی نورنگ شاہ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ نورنگ شاہ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا اور گھر میں تعلیم حاصل کرنے والا اکلوتا فرد تھا۔ جب وہ ہاؤس جاب مکمل کر کے پنڈی کے ایک ہسپتال میں ڈاکٹر تعینات ہوا، گاؤں میں جشن منایا گیا اور فراخ دلی سے مٹھائی بانٹی گئی۔

کچھ عرصہ گزرنے پر ڈاکٹر نورنگ شاہ کو بیرون ملک جانے کا خبط سوار ہو گیا۔ باپ مان گیا مگر بڑا بھائی پربت شاہ اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ نورنگ شاہ ملک سے باہر جائے۔ اس نے باپ کے سامنے سرکشی اختیار کرتے ہوئے ٹھونک بجا کر کہہ دیا، "نہیں بابا! نورنگ کو ملک سے باہر جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ درختوں بھری وادیوں کا مالک باہر جا کر گوروں کی نوکری کرے، یہ پربت شاہ کو گوارا نہیں ہے۔ اسے جو چاہیے، میں حاضر کرتا ہوں۔ اگر یہ ہسپتال بنانا چاہتا ہے تو جگہ دیکھے اور ہسپتال کا نقشہ بنوائے۔ میں روپیہ دوں گا۔ اتنا، جتنا یہ منہ سے نکالے گا۔"

نورنگ شاہ نے کہا، "نہیں بھائی! میں وہاں نوکری کرنے نہیں، بلکہ کچھ سیکھنے جا رہا ہوں۔ وہ لوگ میڈیکل سائنس میں ہم سے بہت آگے ہیں۔"

پھر چند ہی دنوں میں دونوں بھائیوں کے درمیان یہ اختلاف کھلم کھلی ضد کی صورت اختیار کر گیا۔ بابا کو پربت شاہ کی سرکش خو کا اندازہ تھا۔ اپنے لاڈلے بیٹے کے شوق کا خیال بھی تھا۔ اس نے فوری طور پر پربت شاہ کے موقف کی حمایت کا اعلان کر دیا اور نورنگ

شاہ کو سختی سے باہر جانے سے روک دیا مگر اس کے دل میں کچھ اور تھا جو دو ماہ بعد کی ایک رات کے نصف حصے میں نورنگ شاہ کے سامنے آیا۔ بابا اس کے کمرے میں آ گیا۔ اس کی حیرانی کو پسِ پشت ڈال کر اس کے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اسے رازدارانہ انداز میں قریب کر کے بولا،''نوری شاہ! تم مجھے ساری دنیا سے پیارے ہو۔ تمہارا اُترا ہوا چہرہ مہینہ بھر سے دیکھ رہا ہوں اور دل ہی دل میں کڑھ رہا ہوں۔ تمہیں بڑے بھائی کی ضد کا علم ہے۔ وہ جس بات پر اڑ جاتا ہے، پھر سر جائے تو بھلے چلا جائے، اپنی بات سے نہیں ہٹتا۔ میں نے اس لیے اس کی بات مان کر تمہارا دل توڑا تھا۔ آج جوڑنے آیا ہوں۔ پربت شاہ گول پہاڑ کے چند درختوں کا سودا کرنے خانس پور گیا ہوا ہے۔ دو دن سے پہلے نہیں لوٹے گا۔''

نورنگ شاہ کے پلے بابا کی باتیں نہیں پڑ رہی تھیں مگر براہِ تکریم خاموشی سے سن رہا تھا۔ بابا کہہ رہا تھا،''میں نے پربت شاہ سے چوری تمہارے لیے انگلستان کے ویزے کی کوششیں جاری رکھی تھیں۔ آج تمام بندوبست ہو گئے ہیں۔ میں تمہیں ایک کارڈ دیتا ہوں۔ وزیٹنگ کارڈ۔ تم علی الصباح اسلام آباد چلے جاؤ۔ اس کارڈ والے آدمی سے ملو۔ وہ تمہیں پانچ سات دنوں کے اندر پاکستان سے نکال دے گا۔ میں نے ساری پے منٹ کر دی ہے۔''

نورنگ شاہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ بابا اس کے لئے ایسے سوچتا ہے؟ آنکھیں بھیگ گئیں۔ بابا کے پہلو میں بیٹھنا ممکن نہ رہا اور بے ساختہ اٹھ کر پیروں میں بیٹھ گیا، بھرائے ہوئے لہجے میں بولا،''بابا! یہ سب کیا ہے؟''

''یہ میری محبت ہے۔ اس بارے میں زیادہ نہ سوچو۔ انگلستان کی سوچو۔ ہاں! جلد واپس آ جانا۔ تمہارے بغیر ایک دن نہیں گزرتا، مہینے اور سال کیسے گزاروں گا۔'' بابا کا لہجہ بھی نم ہو گیا۔

بابا کی ہدایات کے پیشِ نظر وہ لاہور کا بتا کر گھر سے نکلا۔ اسلام آباد سے ہوتا ہوا پانچویں دن انگلینڈ پہنچ گیا۔ یہاں سے اس کے لئے ایک نئی جدوجہد کا باب کھل گیا۔ وہ ڈاکٹر تھا اور اس ملک میں ڈاکٹرز کی قدر و منزلت کہیں زیادہ تھی مگر اسی تناسب سے بڑے چیلنجز کا سامنا بھی تھا۔

جونہی ماں کو...... ماں کے بعد پربت شاہ کو نورنگ شاہ کے انگلینڈ پہنچنے کا علم ہوا، انہوں نے طوفان سر پر اٹھا لیا۔ بابا کو معاملات سنبھالنے کی کوئی ترکیب نہ سوجھی تو اس نے لب بستگی اختیار کر لی۔ نورنگ سے چھوٹا ایک بیٹا اور تھا۔ اس کی جیپ مری جاتے ہوئے ایک کھائی میں گر گئی۔ دو دن بعد بیٹے کی لاش گھر میں پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ بابا کی کمر ٹوٹ گئی۔ جواں سال کنوارا بیٹا آن واحد میں ہاتھوں سے نکل گیا تھا...... ایسے میں پربت شاہ نے سنبھالا دیا۔ چند دن بعد ہی نورنگ شاہ کو واپس منگوانے کے لیے بابا پر زور دینے لگا۔ آس پاس کے لوگوں نے بھی یہی مشورہ دیا مگر بابا نے مان کر نہ دیا۔ اس نے نورنگ شاہ کو اس کے بھائی کی فوتگی کی اطلاع بھی نہیں دی تھی۔ وہ

چاہتا تھا کہ نورنگ شاہ اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کر کے ہی واپس آئے۔

دو سال میں ہی نورنگ شاہ کی جدائی، فیض شاہ کی موت اور پربت شاہ کی سرد مہری نے بابا کو چارپائی کی تحویل میں دے دیا۔ اس نے اپنی زندگی کا رہتا ہوا ایک سال چارپائی پر پڑے پڑے گزار دیا۔ دنیا سے عملی طور پر کٹ کر رہ گیا۔ چونکہ نورنگ شاہ سے رابطے کی واحد سبیل خط و کتابت تھی، اور خط کا پتہ محض بابا کے پاس تھا، بابا نے زبانی یاد کر رکھا تھا، کہیں لکھا ہوا نہیں تھا، اس لیے پربت شاہ خواہش کے باوجود نورنگ شاہ کو بلا نہ سکا۔ بابا نے فیض شاہ کی موت کے بعد اپنی بیماری کی خبر بھی انگلینڈ نہ بھیجی۔ جب بابا کا انتقال ہوا تو اس کے دو سال بعد تک نورنگ شاہ خط کا انتظار کرتا رہا، خط لکھتا رہا مگر جواب سے محروم رہا۔ اس کے تمام تر خطوط بابا کے بعد پربت شاہ کو ملے جنہیں وہ پڑھ نہیں سکتا تھا۔ پڑھائے بغیر پھاڑ کر پھینک دیا کرتا تھا۔ اس نے ایک طرح سے نورنگ شاہ کو اپنی زندگی سے کاٹ پھینکا تھا۔

جب ماں نے اگلا سفر اختیار کیا تو پربت شاہ نے نورنگ شاہ کے نام خط لکھوایا۔ چند سطروں پر مشتمل اس خط میں لکھوایا، ''ڈاکٹر نورنگ شاہ! چار سال پہلے فیض شاہ، تین سال پہلے تمہارا بابا اور اب، یعنی پچھلے بدھ کو تمہاری ماں مر گئی۔ تمہارا اب یہاں کوئی نہیں۔ وہیں بیٹھ کر رو دھو لینا۔ میرے کاندھے پر سر رکھ کر رونے کے لئے وطن واپس نہ آنا ورنہ میں ایک اور جنازہ اٹھالوں گا۔ ہمیشہ کے لئے خدا حافظ!''

نورنگ شاہ پر یہ خط قیامت بن کر گرا۔ وہ کئی ماہ خالی الذہنی کی کیفیت میں اپنے اپارٹمنٹ میں پڑا رہا۔ دوستوں نے حوصلہ دیا۔ اسے سمجھایا کہ مرنے والوں کی قربانیوں کو رائیگاں کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تم ٹکٹ لے کر گھر کا چکر لگا آؤ۔ قبریں دیکھ آؤ۔ ایسا کرنے سے دل کو کچھ قرار آجائے گا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے بڑے بھائی کا چہرہ لہرا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ پربت شاہ نے جو لکھوا بھیجا ہے، وہی سچ ہے۔ پربت شاہ کی ظالمانہ خو اُسے خون میں نہلا دے گی۔ اس نے پربت شاہ کی دھمکی کو دل پر لیا اور ہمیشہ کے لئے پاکستان جانے کا خیال دل سے نکال دیا۔

ڈاکٹر الیگرٹ سے اس کی دوستی خاصی پرانی تھی۔ وہ بہت وضعدار عورت تھی۔ اس کی کئی سال پیشتر اپنے خاوند سے علیحدگی ہو چکی تھی۔ بچوں کے جھنجھٹ سے آزاد تھی۔ وہ نورنگ شاہ سے شادی کی خواہاں تھی جبکہ نورنگ شاہ نے اسے دوستی کی لکیر سے آگے آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ جب اسے اس سانحے کا علم ہوا تو وہ دل جوئی کے بہانے دل کی سلطنت فتح کرنے میدان میں کود پڑی جس میں اسے کامرانی حاصل ہوئی۔ چند ماہ بعد دونوں نے شادی کر لی۔ اس نے شادی کے بعد کی زندگی نورنگ شاہ کی خواہش کے مطابق

گزاری اور اسے شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ جب سنبل پیدا ہوئی تو دونوں نے اپنے دوستوں کو بلا کر بہت بڑی پارٹی کی۔ خوشی منائی۔ رات گئے جب بھیڑ چھٹی اور میاں بیوی کمرے میں اکیلے رہ گئے تو نورنگ نے کہا،''الیگ...... میں تم سے ایک اجازت چاہتا ہوں۔''

وہ الیگرٹ کو پیار سے 'الیگ' کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ وہ ہمہ تن گوش ہوگئی تو نورنگ نے کہا،''ہم دونوں نے اپنے مذاہب چھوڑے بغیر اپنی اپنی وش کے تحت شادی کی تھی۔ شادی کے بعد میں نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ تم عیسائیت کو چھوڑ کر میرا مذہب اختیار کرلو۔ میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا؟''

''میں سمجھ گئی ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔'' الیگ نے مسکرا کر کہا،''تم اپنی بیٹی کے مذہب کے بارے میں پریشان ہو۔ اگر ایسا ہی ہے تو میرے پاس اس کا ایک موزوں حل ہے۔ کیا میں پیش کروں؟''

نورنگ نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولی،''اسے مسلمان بننا چاہیے یا کرسچن؟ یہ فیصلہ ہمارے درمیان علیحدگی کا سبب بن سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں یہی پریشانی لاحق ہے۔ میں تب سے اس بارے سوچ رہی ہوں جب سے میں نے اسے پہلی بار اپنے پیٹ میں محسوس کیا تھا۔ ہاں! تو میں کہہ رہی تھی کہ اسے دونوں مذاہب سے روشناس کرا دیا جائے۔ اٹھارہ سال کی عمر تک اسے دونوں ٹیوٹرز دیے جائیں۔ اس کے سامنے کبھی تم اپنی خواہش کا اظہار کرو گے نہ میں اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کروں گی۔ جب یہ بڑی ہو جائے تو اس پر ہی فیصلہ چھوڑ دیا جائے۔ اگر مسلمان ہونا چاہے گی تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر یہ عیسائیت کو گلے لگائے تو تم دل برا نہیں کرو گے۔ بولو! منظور ہے؟''

نورنگ شاہ نے چند منٹ سوچنے کا وقت لیا۔ اسے الیگرٹ کی ترکیب اچھی لگی۔ تفہیمی انداز میں سر ہلا کر بولا،''آئی ایگریڈ وِد یو الیگ...... اگلی بات یہ ہے کہ اس معاملے میں ہم میں سے کوئی بھی بے ایمانی نہیں کرے گا۔''

الیگ نے مسکرا کر وعدہ کرلیا۔

اس معاملے میں دونوں نے عمر بھر بے ایمانی کا ارتکاب نہیں کیا تھا۔ وہ ایک لگے بندھے معمول کے تحت روزانہ ایک گھنٹہ کے لیے اسلامک سنٹر جایا کرتی تھی جبکہ اتنا ہی وقت چرچ میں صرف کرتی تھی۔ لڑکپن کی سرحد عبور کرنے تک اس نے کئی مرتبہ عیسائیت سے وابستگی کا اعلان کیا اور کئی مرتبہ خود کو مسلمان کہا۔ اس کے ماما پاپا نے اس کے ہر اعلان سے لاتعلقی ظاہر کی اور کہا کہ ابھی اس اعلان کا موزوں وقت نہیں آیا۔

وہ غیر محسوس طور پر پاپا کے بہت قریب رہا کرتی تھی۔ اسے پاپا کا مشفقانہ رویہ اچھا لگتا تھا۔ وہ ہر کام میں احتیاط پسند تھا۔ توازن پسند

تھا۔ گھر کی ہر چیز کو اس کے حقیقی مقام پر رکھنے پر مصر رہا کرتا تھا۔ وہ جب بھی ترتیب میں گڑبڑ کرتی، نورنگ شاہ اپنے ہاتھوں سے گھر کی آرائش از سرِ نو کر دیا کرتا تھا۔ ایسے میں بڑبڑاتے ہوئے اسے ڈانٹتا بھی رہتا تھا۔ وہ ایک طرف کھڑی مسکراتی رہتی تھی۔

ماما کے پاس وقت کم ہوا کرتا تھا۔ سنڈرلینڈ میں لیڈی ڈاکٹرز کی غیر معمولی کمی واقع ہوئی تھی۔ اس کے برعکس پاپا کے پاس فارغ وقت ہوا کرتا تھا۔ وہ بڑے شوق سے سنبل کو اُردو پڑھایا کرتا تھا۔ تدریسی وقت میں اس کے ساتھ اردو بولا کرتا تھا۔ کہا کرتا تھا،"میرے چاند! تمہیں ایک نہ ایک دن، زندگی میں کبھی نہ کبھی پاکستان جانا پڑے گا۔ میں تمہیں اُردو اس لیے سکھا رہا ہوں کہ تم پاکستان جا کر اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہ کرو اور لوگ تمہیں انگریز سمجھ کر تماشا نہ بنا دیں۔"

وہ سنبل کو پاکستان کے بارے میں بہت کچھ بتایا کرتا تھا۔ سنبل ان کی پاکستان میں گزری ہوئی زندگی کے بارے دلچسپی لیتی تو وہ جواب دینے سے گریز کر جاتا۔ کہتا،"پاکستان بہت خوب صورت ملک ہے۔ میرا آبائی گاؤں جنت کا ٹکڑا ہے۔ تم کبھی جاؤ گی تو دیکھ کر حیران رہ جاؤ گی۔"

"پاپا! کیا سنڈرلینڈ سے بھی زیادہ خوب صورت ہے؟" سنبل حیرانی سے پوچھتی۔

سنڈرلینڈ الیگ کا آبائی شہر تھا۔ وہ جذباتی طور پر اس دھرتی سے جڑی ہوئی تھی۔ جواب دینے میں نورنگ شاہ تامل کرتا، کہتا،"سنڈرلینڈ کا حسن الگ، سندر بن کی خوب صورتی الگ...... دیکھنے والے کی آنکھ کا انجذاب اور قلبی وابستگی کا عنصر اور الگ...... میں اس بارے میں کچھ طے نہیں کر سکتا۔ کبھی دیکھو گی تو خود ہی محسوس کرنے کی کوشش کرنا، شاید تمہیں وہ جواب مل جائے جو تمہیں مجھ سے نہیں ملا۔"

ساحل کی ریت پر سن باتھ لیتے ہوئے اس نے الیگ کی موجودگی میں پاپا سے پوچھا تھا،"مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے سندر بن کیوں چھوڑا تھا؟"

نورنگ شاہ چونک گیا، بولا،"کیا پکنک کا مزہ کرکرا کرنا چاہتی ہو؟"

وہ ٹلنے کے بجائے مصر ہو گئی۔ نورنگ شاہ نے کہا،"میں نے آدھی زندگی وہاں گزار دی تھی۔ آدھی کہیں اور گزارنا چاہتا تھا کیونکہ زندگی دوسری مرتبہ نہیں ملتی۔"

"پھر تو آپ نے یقینی طور پر سندر بن اور سنڈرلینڈ میں موازنہ بھی کیا ہو گا۔ کسے بہتر پایا پاپا؟"

سنبل کے ذہانت آمیز سوال پر الیگ بھی چونکی۔

نورنگ نے ایک آہ بھری۔ الیگ کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں عجیب یاس اور چاشنی کا امتزاج رچ بس گیا۔ بولا،"تمہاری ماما اور تمہارے علاوہ سندر بن کو بہتر پایا۔"

''تو پھر ہمیں لے کر سندر بن چلے کیوں نہیں گئے؟ کیا آپ کو یہ خوف ہے کہ ہم آپ کے ساتھ پاکستان نہیں جائیں گی؟'' سنبل راکھ کرید رہی تھی۔

وہ الیگ کی خود پر مرتکز آنکھوں سے بچ کر آہستگی سے بولا، ''نہیں میری جان! وہ سنڈر لینڈ سے زیادہ خوب صورت تو ہے مگر محفوظ نہیں۔''

الیگ نے ان کی گفتگو میں حصہ نہیں لیا مگر اثر انداز ہو رہی تھی۔ یہ بات سنبل نے محسوس کر لی اور موضوع بدل دیا۔

غیر محسوس طور پر نورنگ اور الیگرٹ اس موزوں وقت کا انتظار کر رہے تھے جب سنبل اپنی تعلیم مکمل کر کے، اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر اپنے مذہب کا اعلان کرتی مگر اس وقت کے آنے سے دو سال قبل ہی نورنگ شاہ دماغی شریان پھٹنے سے انتقال کر گیا۔ اس کی وفات الیگ کے لئے سانحے سے کم نہیں تھی۔ وہ چند ماہ میں ذیابیطس کا شکار ہو گئی۔ ایک سال میں ہی ہاسپٹلائز ہو کر رہ گئی۔ سنبل نے اپنے باپ کی تربیت کے پیشِ نظر بڑی دل جمعی سے ماما کی خدمت کی۔ اس کا ہر طرح سے خیال رکھا۔ الیگ نے بھی نورنگ سے کیے گئے معاہدے کا آخری سانس تک پاس رکھا۔ جب بھی سنبل نے اس سے مذہب سے متعلقہ کوئی مشورہ طلب کیا، اس نے جواب دیا، ''قطعاً نہیں سنبل...... چونکہ میں اس معاہدے کی فریق ہوں، اس لیے تمہیں کوئی مشورہ نہیں دے سکتی۔ تم اپنے دوستوں سے مشاورت کرو۔ اگر تین عیسائیوں سے مشورہ مانگو تو تین مسلمانوں سے بھی ضرور پوچھ لینا...... پھر جو دل کو لگے، اسے ذہن میں ڈال دینا۔ میں نورنگ شاہ کو دھوکہ نہیں دے سکتی۔''

جب وہ اٹھارہ سال کی ہوئی تو اس کے فیصلے پر خوش یا ناخوش ہونے کیلئے معاہدے کا کوئی فریق بھی زندہ نہیں تھا۔ وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کے لئے رات بھر جاگتی رہی مگر ناکام رہی۔ رت جگوں کا سلسلہ طویل ہو گیا۔ پھر کئی دنوں کی الجھن سے اس نے یہ سوچ کر چھٹکارا حاصل کیا، 'نہیں سنبل! تمہیں کوئی جلدی نہیں ہے۔ نماز پڑھا کرو، چرچ جایا کرو۔ ابھی زندگی کو سوچنے کے لئے مزید مہلت دے دو۔'

اس نے اس اہم ترین معاملے کو التوا میں ڈال دیا۔ وہ بہت خوب صورت تھی، صحت مند تھی اور خوب قد کاٹھ نکال چکی تھی۔ اس کے حسن میں ابھرنے والا مشرقیت اور مغربیت کا قدرتی امتزاج دیکھنے والے کی آنکھیں چندھیا دیتا تھا۔ وہ ایک طرف الیگ کا حسن چرانے میں کامیاب رہی تھی تو دوسری طرف نورنگ شاہ سے ذہانت وصول کر چکی تھی۔ بچپن سے ہی اسے پولیس ڈیپارٹمنٹ نے متاثر کر رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے تعلیم مکمل کرتے ہی ایڑی چوٹی کا زور لگایا، تربیت حاصل کی اور پولیس کا شعبہ جائن کر لیا۔ چونکہ وہ جذباتی میلان نہیں رکھتی تھی اور نہ ہی بہت جلد کسی سے متاثر ہوتی تھی، اس لیے اس کے مزاج کی پختگی نے اسے دو سالوں میں ہی اسسٹنٹ سارجنٹ کے عہدے پر فائز کر دیا۔

الیگ اور نورنگ نے اس کے لئے نہ صرف سنڈر لینڈ کے پوش ایریا میں ایک چھوٹا مگر نہایت دلکش بنگلہ چھوڑا تھا بلکہ ایک اچھی خاصی رقم بھی اسے ترکہ میں ملی تھی۔ دونوں کامیاب ڈاکٹر تھے۔ عمر بھر انسانیت کا احترام کرتے رہے تھے۔ اس لیے ان کے بعد ان کا نام کمیونٹی میں بڑے احترام سے لیا جاتا تھا۔ سنبل کے حصے میں بھی یہ احترام آیا تھا۔ چونکہ اس کے ہاں پونڈز کی کمی نہیں تھی، ہر ماہ معقول سیلری بھی ہاتھ لگ جاتی تھی، اس لیے وہ منفی رویوں سے ہمیشہ دور رہی۔ ڈیپارٹمنٹ میں اسے 'نائس لیڈی' کا خطاب ملا۔ اسے کے کئی کنوارے کولیگز نے اسے شادی کی دعوت دی مگر اس نے برامنائے بغیر ٹال دیا۔ وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وہ ہر ویک اینڈ پر مختلف لینڈ اسکیپ وزٹ کیا کرتی تھی۔ تعطیلات میں اس نے یورپ کے کئی اہم ملکوں کی سیر بھی کر لی تھی۔ یوں وہ اپنی زندگی سے بے حد مطمئن تھی۔ جب اس کے پاس کرنے کیلئے کوئی کام نہیں ہوتا تھا، یا اپنی پیشہ وارانہ امور سے اُکتا جاتی تھی تو ماما اور پاپا کے سٹڈی روم میں گھس جایا کرتی تھی۔ اس کیو بک روم میں طبی لائبریری کے علاوہ مطالعے کے لیے بہت کچھ رکھا ہوا تھا۔ ماما شارٹ نوٹس لکھنے کی عادی تھی، پاپا ڈائری اور خطوط لکھنے کے شائق تھا...... موصول ہونے والے خطوط اوریجنل حالت میں اڑ وائر فائل ہوئے تھے جبکہ بھیجے گئے خطوط کی فوٹو کاپیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ہر فائل کے اوپر سال کے ہندسے درج تھے۔ اسے پاپا پر بہت پیار آتا تھا جب وہ دیکھتی تھی کہ دونوں قسم کے خطوط کو مکالمے کی صورت میں ترتیب دیا گیا تھا۔ سوال، پھر اس کا جواب...... در جواب...... ان خطوط اور ڈائریوں کے طویل مطالعے کے بعد وہ پاپا کی زندگی کے ہر پہلو سے روشناس ہو گئی تھی۔ وہ دور ہونے کے بجائے پاپا کے اور قریب ہو گئی۔ اسے ایک طرح سے اپنے پاپا کے حالات سے ہمدردی ہو گئی۔

پاپا نے اپنے بابا کے نام ان گنت خط لکھے تھے۔ ان گنت خط وصول کیے تھے۔ ان کا مطالعہ ہمیشہ سنبل کی آنکھیں نم کر دیا کرتا تھا۔ وہ اپنے دادا کے دکھ کو اپنے پہلو میں محسوس کرتی تو بکھر سی جاتی۔ اسے انہی مکالموں سے پتہ چلا تھا کہ اس کا باپ نورنگ شاہ غریبوں کا ہمدرد تھا۔ وہ کسی پر ظلم برداشت نہیں کرتا تھا۔ گاہے بگاہے اپنی کمیونٹی کے لوگوں کی مالی امداد کیا کرتا تھا۔ اس کے چچا پربت شاہ پر یہ حرکتیں گراں گزرتی تھیں۔ وہ کہتا تھا کہ نورنگ نے ان ناکارہ اور نسل در نسل چلے آتے غریب لوگوں کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔

پھر جب اونچے پہاڑ کے دامن میں نورنگ شاہ نے تین بے آسرا خاندانوں کو رہائش کے لئے تھوڑی سی جگہ دی تو پربت شاہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے ان لوگوں کو تو دن چڑھنے سے پیشتر ہی ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا، ان کے سامان کو اکٹھا کر کے آگ کا شعلہ دکھا دیا مگر بابا کی موجودگی میں نورنگ شاہ کو قائل نہ کر سکا۔ مگر پربت شاہ بڑا تھا۔ اس کا حکم ماننا نورنگ شاہ پر واجب تھا۔ خاندانی تربیت یہی تھی۔ جب اس کے دل میں حبس بھر گیا، سانس کی راہ دشوار ہو گئی تو اس نے سندر بن چھوڑنے اور انگلینڈ آنے کا اعلان کر دیا۔ چونکہ پربت شاہ جانتا تھا کہ وہ اس کے رویے کے باعث احتجاجی انداز اختیار کر رہا تھا، اس لیے اس نے بھرپور مخالفت کی مگر اسے روکنے میں

کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بعد پربت شاہ نے اپنے بابا پر دباؤ ڈالا ”بابا! زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ آج یا کل...... سبھی نے یہاں سے پردہ کر جانا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ جیتے جی تمام جائیداد میرے نام کر دیں۔ اگر نورنگ کو آدھی جائیداد ملی تو وہ اپنی عادت کے مطابق لچ لفنگوں میں بانٹ کر آپ کی وراثت کا بیڑہ غرق کر دے گا۔“

بابا نے اسے حق تلفی قرار دیا۔ جب پربت شاہ کا اصرار منفی انداز اختیار کر گیا تو ایک دن بابا نے چپکے سے ریونیو ڈیپارٹمنٹ کا رخ کیا۔ اپنی وسیع و عریض اراضی کے دو برابر حصے کر دیے۔ دونوں بیٹوں کے نام جائیداد کا برابر بٹوارا کر دیا۔ جب پربت شاہ کو اس کی خبر ہوئی تو وہ آگ بگولہ ہو کر بابا پر چڑھ دوڑا۔ بابا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ کچھ بھی سننے اور ماننے کو تیار نہیں تھا۔

بالآخر اس نے جھگڑے کا اختتام اس تقریر پر کر دیا ”بابا! تم نے میرا حق غصب کرتے ہوئے یہ ساری وادی نورنگ کے نام کر دی ہے۔ مجھے پچھلی وادی دی ہے۔ میں اس فیصلے کو قبول نہیں کرتا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تمام جائیداد مجھے دی جاتی کیونکہ میں نے تمہیں نہیں چھوڑا۔ تمہارے بڑھاپے کا سہارا بنا ہوں جبکہ وہ بے وفا نکلا، تمہیں چھوڑ گیا اور اس نے لوٹ کر تمہاری خبر تک نہیں لی۔ اگر تمہیں اس کا اتنا ہی خیال تھا تو بندرہ وادی اس کے نام کر دیتے اور سندر بن مجھے دیتے۔ وادی کے ساتھ ساتھ اب وہ اس حویلی اور گاؤں کا مالک بھی بن گیا ہے جبکہ میرے حصے میں صرف جنگل آیا ہے۔ اس کا میں کیا کروں؟...... اب تم میرا فیصلہ بھی سن لو۔ میں تمہارے نورنگ کو سندر بن کا ایک درخت بھی نہیں دوں گا۔ وہ کیا، اس کی سات نسلیں بھی سندر بن میں قدم نہیں رکھ سکیں گی۔ خدا کرے کہ تم وہ وقت دیکھنے کے لئے زندہ رہو جب وہ سندر بن میں قدم رکھے اور میں اس کی قمیص سرخ کروں۔“

اسے مطمئن کرنے کے لئے بابا نے سندر بن کے عقب میں واقع بندرہ وادی کی پرفضا ڈھلان میں ایک شاندار حویلی تعمیر کرائی۔ اس کے چاروں اطراف میں کوئی درجن بھر چھوٹے مکانات بھی تعمیر کرائے جہاں پربت شاہ اپنے ملازمین کے خاندانوں کو ٹھہرا سکتا تھا۔ یہ سب کرنے کے باوجود وہ پربت شاہ کو راضی نہ کر سکا۔ اس کا غصہ فرو نہ ہوا۔ بابا چاہتا تھا کہ نورنگ شاہ اور پربت شاہ کے درمیان نفرت کی دیوار حائل نہ رہے اور اس کے مرنے کے بعد دونوں بھائی محبت سے رہیں مگر وہ تادمِ آخر اپنی خواہش کی تکمیل نہ کر پائے۔ سندر بن کے جملہ واقعات اور حالات سے بابا نے نورنگ شاہ کو خطوں کے ذریعے آگاہ رکھا۔ کہیں کہیں اس کے لئے یہ مشورہ بھی درج تھا کہ وہ اپنی بقیہ زندگی سندر بن سے دور گزار دے۔

سنبل کا بچپن جن سوالوں کے جوابات کی کھوج میں گزرا تھا، ان سب کے جواب اسے پاپا کی تحریروں سے مل چکے تھے۔ اپنی بنیاد سے کٹ کر دور گرے ہوئے درخت کے اندرونی دکھ کا احساس ہوتے ہی وہ پاپا کو بہت دلیر انسان سمجھنے لگی اور دل ہی دل میں اسے پوجنے لگی۔

اس کے ذہن میں جس سندر بن کا نقشہ کھنچ چکا تھا، اس میں وہ کبھی بھی پاؤں رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کبھی بھی پاکستان آنے اور اپنے پاپا کے گاؤں کو دیکھنے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ عالمی سطح پر پاکستان کا جو ڈراؤنا امیج بنایا گیا تھا، وہ بھی اس حق میں نہیں تھا کہ وہ ادھر کا رخ کرتی۔ اس کی زندگی بڑے مزے میں گزر رہی تھی اور وہ اگلی تعطیلات میں کنیڈا کی سیاحت کا پروگرام ترتیب دے رہی تھی مگر ایک فیس بک فرینڈ نے اس کا سکون غارت کر دیا۔

ایک شب، جب وہ انٹرنیٹ پر بیٹھی سندر بن کا عنوان دے کر سرچ کر رہی تھی تو اسے فیس بک میں ایک بھولا بھالا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ سمیر تھا۔ معصوم صورت...... سادہ لوح...... بمشکل چودھویں سن میں...... سنبل نے اسے دوستی کی پیش کش کر دی جسے سمیر نے قبول کیا اور اس کی فرینڈز لسٹ میں شامل ہو گیا۔ وہ رومن اُردو میں چیٹنگ کرتا تھا۔ سنبل کے لئے اس کی ذات میں دلچسپی کی واحد وجہ یہ تھی کہ وہ نورنگ شاہ کے گاؤں 'سندر بن' کا رہنے والا تھا۔ راولپنڈی میں اپنے ماموں کی کوٹھی میں نوکری کرتا تھا۔ اس کا ماموں پاکستان کا روایتی امیر شخص تھا مگر اس کی تینوں بیٹیاں اس سے مختلف تھیں۔ وہ اپنے پھوپھی زاد سمیر کو فارغ وقت میں پڑھایا کرتی تھیں اور اسے اپنا کمپیوٹر استعمال کرنے کی اجازت بھی دیا کرتی تھیں۔ سمیر جب تنخواہ کی رقم اپنے گھر دینے جاتا تو بڑی ماموں زاد رقیہ کا ڈیجیٹل کیمرہ بھی ساتھ لے جایا کرتا تھا۔ سندر بن کے مختلف مناظر کی عکس بندی کرلاتا اور فیس بک پر اپ لوڈ کر دیا کرتا۔ سنبل جب سندر بن کی نت نئی تصاویر دیکھتی تو چیٹ روم میں اس سے مخاطب ہو جاتی۔ اس سے تصویر کے بارے میں کئی جزئیات دریافت کرتی جسے وہ خوشی خوشی بیان کرتا جاتا۔ اس کے کہنے پر سمیر نے پربت شاہ، اس کی حویلی اور دادا کی قبر کی تصاویر بھی اپ لوڈ کیں جنہیں سنبل نے اپنے کمپیوٹر میں محفوظ کر لیا۔

سمیر نے غیر ارادی طور پر سنبل کے دل میں سندر بن کو دیکھنے کا شوق بھر دیا تھا مگر وہ جونہی پربت شاہ کے بارے سوچتی، اس کی تصویر کو دیکھتی تو اپنے شوق پر دبیز چادر اوڑھا دیتی۔ سمیر پربت شاہ کا بڑا احترام کرتا تھا۔ اسے 'شاہ سائیں' کا خطاب دیا کرتا تھا۔

پھر جب ایک دن اس نے سمیر کو آن نیٹ دیکھا، اس کا حال دریافت کیا تو وہ گویا پھٹ پڑا، اس نے لکھا، ''آج مجھے کچھ نہ کہو۔ میں بہت پریشان ہوں۔''

اس نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ پھر پوچھا، ''مگر یہ تو بتاؤ کہ تم پریشان کیوں ہو؟''

کافی دیر تک چیٹ روم پر مدھم رنگ میں جملہ 'سمیر از ٹائپنگ' آویزاں رہا پھر جو تحریر سنبل کے سامنے آئی، اس نے اس کا دل دہلا کر رکھ دیا، لکھا تھا، ''میرا ابا شاہ سائیں کی حویلی میں کام کرتا ہے۔ پرسوں میرے بابا نے شاہ سائیں کی ولائتی گائے کو کسی وجہ سے چھڑی ماردی۔ وہ بدکی تو ایک پتھر پر سے اس کا پاؤں پھسل گیا۔ جس کے نتیجے میں ڈھلوان میں گر گئی اور اس کی پچھلی ٹانگ ٹوٹ گئی۔

شاہ سائیں کے حکم پر دوسرے نوکروں نے میرے بابا کو اتنا مارا کہ اس کا دایاں بازو اور دائیں جانب کی دو پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ صرف یہی نہیں، گھر کا سامان اٹھانے کی اجازت دیے بغیر میرے گھر والوں کو شاہ سائیں نے وادی سے نکال دیا ہے۔ اب وہ کالکوٹ کے قریب ایک متروک سرکاری عمارت میں دبکے بیٹھے ہیں۔ میرے بہن بھائی دو دن سے بھوکے ہیں۔ کچھ دیر پہلے ہمیں اس قیامت کا پتا چلا۔ ماموں انہیں لینے چلے گئے۔ دعا کریں کہ میرا بابا ٹھیک ہو......''

سنبل کے دل کو گھونسا لگا۔ اس کا سگا چچا اتنا ظالم فطرت شخص تھا؟ اگر اس کے ذہن میں پربت شاہ کی شخصیت کے بارے میں رہا سہا کوئی شک تھا بھی تو وہ ہوا ہو گیا۔ اس نے سمیر کو تسلی دی۔ اسے کہا کہ وہ اپنی کسی ماموں زاد بہن کا اکاؤنٹ نمبر، نام اور شناختی کارڈ نمبر بھیجے تا کہ وہ اسے ایک معقول رقم بطور مدد بھیج سکے۔ سمیر کو منی ٹرانسفریشن کے معاملات کی سدھ بدھ نہیں تھی۔ وہ اپنی ماموں زاد بہن رقیہ کو چیٹ روم میں لے آیا۔ رسمی تعارف میں پتہ چلا کہ وہ ایک اچھے نجی سکول میں ٹیچر تھی۔ رحم دل لڑکی تھی۔ اسے بخوبی احساس تھا کہ اس کا باپ اپنے بھانجے کے ساتھ اچھا رویہ نہیں رکھتا۔ اس نے اپنا نام، شناختی کارڈ کا نمبر اور اکاؤنٹ کی تفصیل دی۔ ویسٹرن یونین کی ایک برانچ سنبل کے گھر کے قریب واقع تھی۔ اس نے فوری طور پر پانچ سو یورو رقیہ کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیے۔

گھر کے فون نمبر پر رقیہ اور سمیر سے پہلی مرتبہ بات چیت بھی کی، دلاسا دیا اور کہا ''رقیہ! سمیر بچہ ہے مگر میرا دوست ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ دوستی میں عمر کی اونچ نیچ نہیں ہوتی۔ میں اس سے اتفاق کرتی ہوں۔ میں دل سے چاہتی ہوں کہ تم اس کا خیال رکھا کرو۔ میں نے کچھ رقم ویسٹرن یونین سے بھجوا دی ہے۔ یہ سمیر کے والد کے علاج کے لیے ہے۔ کیا میں یقین رکھوں کہ تم میری بھیجی ہوئی رقم کو غلط جگہ پر استعمال نہیں کرو گی؟''

رقیہ بہت ذمہ داری سے گفتگو کر رہی تھی، بولی، ''میڈم! میں آپ کو خرچ کی جانے والی رقم کی ڈیٹیل دوں گی۔ آپ خود فیصلہ کر لیجئے گا۔ مجھے اللہ نے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ میں سمیر کی حق تلفی نہیں کروں گی۔ ابو پر میرا زور نہیں ہے۔ وہ جو کرنا چاہیں، کریں، میں روک نہیں سکتی۔ مگر میں اور میری بہنیں سمیر سے محبت کرتی ہیں کیونکہ ہمارا کوئی بھائی نہیں ہے۔ ہم نے سمیر کو اپنا چھوٹا بھائی مان رکھا ہے۔ آپ یقین رکھیں کہ میں اس کا نقصان نہیں ہونے دوں گی۔''

رقیہ نے پھر سمیر سے بات کرائی۔ وہ چیٹ روم میں بہت کچھ لکھ لیتا تھا مگر بولتے ہوئے شرماتا تھا۔ جو کہنا چاہتا تھا، کہہ نہیں پاتا تھا۔ سنبل کے دل میں سمیر کے لئے اور بھی ہمدردی بھر گئی۔ وہ پربت شاہ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی مگر اس کے شر سے متاثر ہونے والے کی تھوڑی سی مدد کر سکتی تھی۔ پانچ سو یورو کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی مگر اسے اندازہ تھا کہ پاکستان میں پہنچ کر یہ رقم سمیر کے باپ کیلئے خاصی کارآمد ہو جائے گی۔ بڑے عرصہ بعد اس نے سمیر اور رقیہ سے اُردو میں گفتگو کی تھی کیونکہ بابا کے بعد کسی سے بولنے کا موقع

ہی نہیں ملا تھا۔ دل میں عجیب سی طمانیت بھر گئی۔ رقیہ کا میٹھا میٹھا لہجہ بہت بھلا لگا۔

آنے والے دنوں میں وہ سمیر اور رقیہ سے ٹیلی فونک رابطے میں رہی۔ اسے ان کے باپ کے کاروباری اوقات کا بخوبی علم ہو گیا کیونکہ اس کی موجودگی میں وہ دونوں سنبل سے کھلی گفتگو نہیں کرتے تھے۔ سمیر کا باپ پنڈی کے ایک سرکاری ہسپتال میں زیرِ علاج تھا۔ وقتاً فوقتاً سنبل نے بارہ سو یورو رقیہ کو بھیجے جو نہ صرف اس کے علاج کے لئے کافی ثابت ہوئے بلکہ آدھی سے زیادہ رقم بچ بھی گئی تھی۔ وہ دونوں اس کے بہت ممنون تھے جبکہ ان کی مالی اعانت کر کے سنبل کا دل پر گداز مسرت حاصل کر چکا تھا۔

سنبل کے ایما پر سمیر کے خاندان نے پنڈی کی ایک مضافاتی بستی میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ سمیر کا باپ شہر میں چھوٹی موٹی مزدوری کرنے لگا تھا جبکہ اس کی ماں نے ایک بنگلے میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ان کے بقیہ رشتہ دار بدستور سندر بن میں ہی مقیم تھے۔

یہ معاملہ انجام پذیر ہو گیا مگر سنبل کا ناتا ایک بار پھر سندر بن سے استوار ہو گیا۔ رقیہ کو سرکاری نوکری مل گئی اور اس کی پہلی تعیناتی کالکوٹ کے پرائمری سکول میں ہوئی تھی۔ اسے خاصا طویل سفر طے کر کے ڈیوٹی اسٹیشن پر جانا پڑتا تھا۔ اکیلے جانے سے ڈرتی تھی اس لیے ہر روز سمیر کو ساتھ لے جاتی۔ اس سکول میں سندر بن کے بچے بچیاں بھی زیرِ تعلیم تھیں۔ ان میں سمیر کے چند رشتہ دار بھی تھے۔ ان کی وساطت سے سنبل کو سندر بن کے حالات سے روزمرہ بنیاد پر آگہی حاصل ہونے لگی۔

سنبل کے لئے یہ حالات دل گرفتگی کا سبب تھے۔ اسے علم ہوا کہ سردار خان نامی ایک شخص جو گزشتہ چند سالوں سے بندرہ والی حویلی میں قیام پذیر تھا، بہت بڑا ڈرگز سپلائر تھا۔ ملک کی سرحدی پٹی کے چند اسمگلرز سے اس کے قریبی تعلقات استوار تھے جن کے توسط سے وہ باقاعدگی کے ساتھ منشیات کی بڑی مقدار سندر بن منگوایا کرتا تھا۔ یہاں سے اطراف کے تمام علاقوں کے ڈیلرز کو سپلائی دی جاتی تھی۔ یہ ڈیلرز پہاڑی دیہاتوں کے سادہ لوح لوگوں کو پہلے تو منشیات بالخصوص ہیروئن کا عادی کرتے تھے، پھر اس کی قلیل مقدار پیک کر کے 'ٹوکن' بناتے جو مہنگے داموں ان عادی نوجوانوں کے ہاتھ بیچا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ اس تواتر اور قانونی روک ٹوک کے بغیر جاری تھا کہ دیہاتوں کے دیہات برباد ہونے لگے تھے۔ اس مکروہ کام کی سرپرستی پولیس کی کالی بھیڑیں اور مفاد پرست حکام کرتے تھے جن کی تجوریوں کے حجم دن بدن بڑھتے جا رہے تھے۔ سردار خان پربت شاہ کی اعانت کے بغیر سندر بن یا بندرہ میں ایک لمحہ بھی گزار نہیں سکتا تھا، اس لیے اس نے شاہ سائیں کو برابر کا پارٹنر بنا رکھا تھا۔ چونکہ سندر بن کی وادی اس خوف ناک دھندے کے لئے آئیڈیل تھی، محفوظ تھی اور عمومی طور پر پولیس کا اس علاقے میں عمل دخل نہ ہونے کے برابر تھا، اس لیے سردار خان اور پربت شاہ کی پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔

جہاں آس پاس کے دیہات اس مکروہ نشے کی لپیٹ میں آئے، وہاں سندر بن کے ان پڑھ اور سادہ لوح باسی بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ ہر دوسرے گھر کا نوجوان جہاز بن کر گلیوں میں چکرانے لگا۔ یہ صورت حال بہت کربیہ تھی مگر پربت شاہ نوٹ گننے میں مصروف تھا۔ کئی مرتبہ سندرہ بن کے معمر غریبوں نے پربت شاہ کو دبے دبے لفظوں میں اپنے گھروں کی تباہی کا دکھڑا سنایا۔ اس نے دادرسی کے بجائے ہر مرتبہ ہنس کر کہا، ''کیا سردار خان گن پوائنٹ پر تمہارے بچوں کو نشہ بیچتا ہے؟''

جب کھلے عام ٹوکن بکنے لگا تو پنڈی سے ایوبیہ تک سندر بن کی بدنامی جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دور دراز سے ٹرک ڈرائیور حضرات اور منشیات کے چھوٹے موٹے ڈیلر چرس، ہیروئن اور افیون کی تلاش میں سندر بن کی طرف آنے لگے۔ وادی کے لوگوں کو ان نت نئی دکھائی دینے والوں کی شکلوں سے نفرت تھی مگر وہ ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ انہیں علم تھا کہ بولنے کی صورت میں پربت شاہ انہیں مار پیٹ کر علاقے سے نکال دے گا۔ سر پر تنی ہوئی چھت جاتی رہی تو وہ کہاں جائیں گے؟...... جہاں علم اور ہمت کی کمی ہوتی ہے وہاں ایسی ہی بزدلی دیکھنے کو ملتی ہے ورنہ غریب آدمی کی گزران کا ماجرا کیا؟...... یہاں کیا، وہاں کیا...... وہ جہاں بھی چلا جائے، ایک سی دنیا، ایک سا ماحول...... جب سارا دن جسم کو سولی پر لٹکا کر شام کو دو لقمے پیٹ میں ڈالنا ہی زندگی ہو تو پھر اس میں ہجرت کا کا ڈر کیا اور پڑاؤ کے معانی کیا...... کولہو کے بیل کی طرح زندگی کی چکی پیسنے والے ماہ بہ ماہ اپنے جواں سال گبھرو گنواتے رہے، لب بستہ رہے اور آسمان کی طرف دیکھتے رہے...... کسی غیبی مدد کے لئے آنکھیں نم کرتے رہے۔

چند ماہ بعد سنبل کو سندر بن سے ایک عجیب و غریب خبر موصول ہوئی۔ پربت شاہ نے سندر بن کی بستی خالی کرنے کا حکم دے دیا تھا کیونکہ اس نے سردار خان سے مل کر کالکوٹ سے سندر بن تک جدید طرز کی چیئر لفٹ لگانے کا منصوبہ بنالیا تھا۔ پہلے پوائنٹ سے سندر بن گاؤں تک ایک سیدھ میں لفٹ اپ اینڈ ڈاؤن چل سکتی تھی۔ عین گاؤں والی جگہ پر سٹے ڈیک بنایا جانا ضروری تھا۔ یہاں سے آخری پہاڑی تک کیبل کار کا منصوبہ زیرِ غور تھا۔ سردار خان نے جس کنٹریکٹر کی خدمات حاصل کی تھیں، وہ چاہتا تھا کہ سندر بن کو ٹورازم پوائنٹ بنا کر پوری طرح کمرشلائز کر دیا جائے۔ چیئر لفٹ اور کیبل کار کی وجہ سے اس پوائنٹ سے بہت بڑی آمدنی متوقع تھی۔

پربت شاہ نے سندر بن کو مسمار کرنے کے ساتھ نئی بستی کے لئے بندرہ میں تھوڑی سی ناکارہ زمین مختص کر دی تھی۔ سندر بن کے باسیوں کو یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ انہیں اپنے مکانات خود تیار کرنا ہوں گے۔ تین پشتوں سے بیٹھے ہوئے غریب مزدور لوگوں پر قیامت ٹوٹنے کی یہ ہولناک خبر سن کر سنبل کا دل مٹھی میں آگیا۔ یوں لگا جیسے اس کے سینے میں نورنگ شاہ کے دل نے زندگی کی سانسیں لینا شروع کر دی تھیں۔

وہ کئی دن اس سوچ میں مستغرق رہی۔ وہ ان اجنبی لوگوں کے لئے کیا کر سکتی تھی؟ بالآخر اس نے رقیہ سے دریافت کیا، ''تم مجھے یہ بتاؤ

کہ میں ان لوگوں کے لئے کیا کرسکتی ہوں؟‘‘

رقیہ نے آزردگی سے کہا،’’میڈم! آپ کچھ بھی نہیں کرسکتیں۔ یہ پربت شاہ کی ذاتی جائیداد ہے۔ وہ اس پر کچھ بھی تعمیر کرسکتا ہے۔‘‘

وہ بولی،’’مگر میں نے سنا ہے کہ یہ وادی اس کے بھائی کی ملکیت ہے، پربت شاہ کی نہیں ہے۔‘‘

’’یہ آپ نے کہاں سے سنا ہے؟‘‘

’’جہاں سے بھی سنا، سچ سنا ہے۔‘‘سنبل نے یقین کے ساتھ کہا۔

سمیر سن رہا تھا، اس نے اپنا منہ ریسیور کے نزدیک کیا، کہا،’’آپی کو نہیں پتہ، میں بھی زیادہ نہیں جانتا۔ بابا جانتا ہے۔ وہی تمہیں بتائے گا۔ میں اسے شام کو یہاں لے آؤں گا۔ تم اس وقت فون کرنا۔ اوکے!‘‘

وہ اس سے بہت زیادہ فرینک تھا۔ برابری کی سطح پر دوست بننے کی کوشش کرتا تھا۔ اچھا لگتا تھا۔ برا نہیں لگتا تھا۔ کبھی کبھار فلمی ڈائیلاگ بھی ماردیتا تھا۔ وہ مسکرائی، بولی،’’اوکے باس!‘‘

شام میں اس کے بابا نے رسمی علیک سلیک کے بعد مقامی زبان میں اسے بتایا۔ اس گفتگو کا اردو میں رقیہ نے ترجمہ کیا،’’یہ دونوں وادیاں یعنی سندربن اور بندرہ آگے پیچھے واقع ہیں۔ تقریباً ایک جتنے رقبے پر محیط ہیں۔ اگلی وادی شاہ سائیں کے چھوٹے بھائی نورنگ سائیں کی ہے جو یہاں سے برسوں پہلے چلا گیا تھا۔ اب اس کا کوئی پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے، زندہ بھی ہے یا نہیں...... نہ اس کی اولاد کا پتہ ہے۔ اس لیے عملی طور پر اس کا مالک بھی شاہ سائیں ہی ہے۔ ہم لوگ برسوں سے دعائیں مانگ رہے ہیں کہ خدا کسی جانب سے نورنگ سائیں کو اس دھرتی پر اتار دے مگر ابھی تک کسی کی دعا قبول نہیں ہوئی اور وہ نہیں آیا جس کے انتظار میں برسوں سے سیکڑوں آنکھیں راہ پر جمی ہوئی ہیں۔‘‘

سنبل کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کا پاپا اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ ان لوگوں کی دعائیں کبھی بھی مراد نہیں پاسکتی تھیں۔ اس نے ابھی تک سمیر کو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس نے پوچھا بھی نہیں تھا۔

سنبل کو اپنے باپ کی خوب صورت جائیداد کے مکروہ استعمال پر دکھ ہوا۔ سوچ میں پڑ گئی کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟...... اس سوال کا جواب ڈھونڈنے میں کئی دن بیت گئے۔ ایک شام اس نے اپنے تئیں فیصلہ کیا کہ وہ پاکستان چلی جائے۔ اب ایسا بھی اندھیر مچا ہوا نہیں ہے کہ وہ پربت شاہ اور سردار خان کو اپنے پاپا کی زمین سے لاتعلق ہی نہ کرپائے۔ اسے خون کے رشتوں پر مان تھا۔ سمجھی کہ جب وہ سندربن میں قدم رکھے گی، اس کا حقیقی چچا اس کی راہوں میں پلکیں بچھائے، نہ بچھائے، اس کی راہ میں حائل نہیں ہوگا۔ اس نے آئندہ چند دنوں میں سمیر اور رقیہ سے اور بھی بہت سی معلومات حاصل کیں۔ اسے پتہ چلا کہ پربت شاہ کے تین بیٹے تھے۔ بڑا افروز شاہ تھا جو

دن کا بیشتر حصہ سردار خان کے ساتھ گزارتا تھا۔ وہ بہت سخت دل واقع ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ملازموں کی ہڈی پسلی ایک کر دیا کرتا تھا۔ کبھی کبھار سرحدی علاقے کا ٹور بھی کیا کرتا تھا۔ اس نے پانچ چھ جرائم پیشہ افراد کا ایک مختصر سا گروہ تشکیل دے رکھا تھا جو اس کی ہیبت میں اضافہ کرتا تھا۔ بندرہ والی حویلی میں جہاں سردار خان اکیلا رہتا تھا، وہ بکثرت آتا جاتا تھا۔ آئے روز شراب وشباب کی محفلوں کا لطف اٹھایا کرتا تھا۔ پربت شاہ کی امیدوں کا مرکز ایک وہی بیٹا تھا جو اس کے نقشِ قدم پر چل کر کامیابیاں سمیٹ رہا تھا۔

دوسرا بیٹا ظفر شاہ تھا۔ وہ انٹر تک پڑھا ہوا تھا۔ سبھی بہن بھائیوں میں سے زیادہ خوبرو تھا۔ نہ جانے کس طرح سردار خان کے دھندے کا شکار ہوگیا۔ پہلے چرس کے کش پھر پنی لگانے لگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے اپنی رگوں میں ٹیکے کے ذریعے 'ٹوکن' اتارنے کا مرحلہ بھی طے کرلیا۔ پربت شاہ نے مختلف شہروں سے اس کا علاج کرایا۔ ہر بار مطمئن ہوجاتا کہ وہ آئندہ اس لعنت میں نہیں پڑے گا مگر دو چار ماہ بعد اسے پھر فضاؤں کی رکھوالی میں مگن دیکھتا تو پکڑ کر کسی اور ہسپتال میں پہنچادیتا۔ اس کی خوراک پر گھر بھر میں بہت توجہ دی جاتی مگر نتیجہ ڈھاک کی تین پات ہی نکلتا۔

سب سے چھوٹا جمال شاہ بہت منہ زور اور سرکش واقع ہوا تھا۔ بڑے بھائیوں سے بات بے بات مائل بہ پیکار رہتا تھا۔ شاید اس کے مزاج کی گرمی کی بدولت اسے لاہور بھیج دیا گیا جہاں وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس کا سندر بن کے معاملات سے بظاہر کوئی تعلق نہیں تھا مگر پربت شاہ کا بیٹا تھا۔ اگر افروز اور ظفر سے دوگام آگے نہ ہوتا تو کم ازکم پیچھے بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ پربت شاہ کی بیوی حویلی تک محدود تھی۔ وہ پربت شاہ اور سندر بن کے معاملات میں قطعاً دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ یہی حال پربت شاہ کی دونوں بیٹیوں کا تھا۔ وہ بے دست وپا تھیں۔ پربت شاہ اور افروز شاہ کے رحم وکرم پر تھیں۔ انہیں برا سمجھتی تھیں یا ان کی حمایت کرتی تھیں، اس کا اندازہ کسی کو نہیں ہو سکا تھا۔

سنبل نے سمیرا اور رقیہ کے توسط سے جمال شاہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اس نے انٹرنیٹ کی دنیا کا سہارا لیا مگر وہ شاید اس دنیا کا باسی نہیں تھا، سو نہ ملا۔ پھر دل کو سمجھایا، ''وہ پربت شاہ کا بیٹا ہے۔ وہ کیوں اس کا ساتھ دے گا؟''

زندگی مختصر ہے، مختصر نہیں بھی ہے۔ ایک بار ملتی ہے۔ اس کا ایک بار ملنا بھی انعام ہے۔ خود بخود گزرتی جاتی ہے۔ اسے نہ تو بڑھاوا دیا جاسکتا ہے اور نہ مختصر کیا جاسکتا ہے۔ بس...... اسے رائیگاں کیا جاسکتا ہے یا امر...... سنبل نے زندگی کو رائیگاں کرنے کے بجائے امر کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ گہری سوچوں کے تانے بانے یہاں آکر ٹوٹے کہ اُسے اپنے چچا اور عم زادوں کو راہِ راست پر لانے کی ایک کوشش تو کرنی چاہیے۔ ایک طرح سے اپنے فیصلے سے مطمئن ہوکر اس نے پاکستان جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

شاید پولیس کی کامیاب نوکری نے بھی اسے کسی حد تک دلیری دی ہو...... یا معاملے کی سنگینی کا اسے پوری طرح احساس ہی نہ ہوا ہو...... بہر حال! جو بھی تھا، جیسے بھی تھا، وہ ایک شام اسلام آباد ائر پورٹ پر کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ارد گرد چلتے پھرتے انسانوں کو حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔

وہ زندگی میں پہلی بار پاکستان آئی تھی مگر نجانے کیا احساس تھا کہ اسے اجنبیت کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ شاید اس اپنائیت کی وجہ یہ تھی کہ سمیر نے اسے سندر بن کے علاوہ اسلام آباد اور راولپنڈی کی ان گنت تصاویر ٹیگ کی تھیں۔ اس نے بہت غور سے انہیں دیکھ رکھا تھا۔ اس نے سنڈرلینڈ سے نکلتے ہوئے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ کسی طور بھی سمیر اور رقیہ سے رابطہ نہیں کرے گی۔ وہ اس کی حیثیت سے لاتعلق تھے، لاتعلق رہتے تو اچھا تھا۔ آنے والے وقت نے یہ ثابت کیا کہ اس کا یہ فیصلہ کسی حد تک غلط بھی تھا۔

وہ طویل سفر سے تھکی ہوئی تھی مگر سندر بن دیکھنے کے لئے بہت بے تاب تھی۔ تبھی ائر پورٹ سے نکلتے ہی اس نے ییلو کیب ٹیکسی کے ذریعے سندر بن کا قصد کیا۔ گھنے جنگل میں چھپے ہوئے گاؤں سندر بن کا استقبالی موڑ مڑتے ہی ملبے کا وسیع و عریض ڈھیر دکھائی دیا۔ سمجھ میں آیا کہ یہاں سندر بن کی آبادی واقع تھی جسے بلڈوز کر دیا گیا تھا۔ ایک پہلو میں بلند ڈھلانی چھتوں والی بڑی سی حویلی سر اٹھائے کھڑی تھی۔ سنبل کا دل دُکھا۔ سمیر نے اسے گاؤں کے کئی فوٹو گراف دکھائے تھے۔ رنگ برنگی جستی چھتوں والا قصبہ کتنا دلکش تھا۔ اب ملبے سے بھرا نشیب دکھائی دے رہا تھا۔ چونکہ اس کا پربت شاہ یا سندر بن کے کسی شخص سے رابطہ نہیں تھا، اس لیے وہ بھرپور سرپرائز بن کر اپنی حویلی کے پورچ میں اتری۔ ڈرائیور کے سامان نکالنے سے پیشتر ہی اس کے گرد نوکروں کا جمگھٹا لگ گیا۔ وہ شکل اور حلیے سے یورپین سیاح دکھائی دیتی تھی۔ لباس بھی بے حد قیمتی تھا۔ ایک ملازم تھوڑی بہت انگریزی جانتا تھا۔ اس نے دریافت کیا کہ وہ کون تھی اور کس سے ملنے آئی تھی۔ اس نے مسکرا کر کہا، ''نو...... آئی جسٹ کم بیک ٹو مائی ہوم......''

وہ بھونچکا رہ گیا مگر اس کی شخصیت کے دبدبے کی بدولت خاموش رہا۔ اس نے ٹف ٹائل کے بنے طویل و عریض فرش پر پڑے سامان کی طرف اشارہ کیا، ''سامان کو اندر پہنچا دو۔ ہری اپ!''

اس نے اُردو میں کہا تھا۔ اب سبھی نوکروں کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھیل گئیں۔ جسے یورپین سمجھا تھا، وہ اردو بولنے والی نکلی تھی مگر پاکستانی لگتی نہیں تھی۔ ایک ہکلایا، ''آپ کو اُردو آتی ہے کیا؟''

وہ لاپروائی سے بولی، ''آتی ہے تو بول رہی ہوں۔ میں یہاں رہوں گی۔ تم جی بھر کر مجھے دیکھ لینا۔ اب یہاں سے جاؤ اور اپنا اپنا کام کرو۔''

چونکہ وہ لڑکی تھی، سامان سمیت آئی تھی، اس لیے اسے بے باکانہ انداز میں حویلی کے اندرونی حصے میں جانے سے کوئی روک نہیں

پایا۔ وہ ایک شانِ استغنا سے چلتی ہوئی زنان خانے میں داخل ہوئی۔ اس کی چچی کو اس کے آنے کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ بھی حیران تھی۔ اپنی بیٹیوں کے ہمراہ داخلی برآمدے میں استقبال کی غرض سے آن کھڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھا تو آنکھوں میں حیرت آمیز اجنبیت بھر گئی۔ آگے بڑھی۔ سنبل کو گلے لگا کر، روایتی انداز میں چوم کر بولی، ''تم کون ہو بیٹی؟''

وہ مسکرائی، پھر گلے میں جھول گئی، بولی، ''آنٹی...... آئی ایم سنبل...... سوری...... میں سنبل ہوں۔''

''سنبل...... کون سنبل...... میرا خیال ہے کہ تم غلط جگہ پر آ گئی ہو۔ یہ ٹیکسی ڈرائیور بھی......''

''نہیں آنٹی...... ٹیکسی ڈرائیور کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں درست جگہ پر آئی ہوں۔'' اس نے کہا، پھر اپنی دونوں بہنوں کی طرف دیکھا۔ وہ برآمدے کے ستون سے لگ کر چپ چاپ کھڑی تھیں۔ حیرت سے معمور آنکھیں لیے اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان کی طرف بڑھی۔ زبردستی گال چوم کر بولی، ''حیران ہیں ناں آپ لوگ...... میں سرپرائزڈ گفٹ ہوں...... یس؟'' پھر ذرا توقف کے بعد، ان کا تجسس مہمیز کرنے کے بعد بولی، ''آنٹی...... میں سنبل ہوں، نورنگ شاہ کی بیٹی...... انگلینڈ سے آئی ہوں۔''

اس کا جملہ گویا بم کی طرح برآمدے میں پھٹ گیا۔ آنٹی کا منہ فرطِ مسرت سے کھل گیا۔ اس کی طرف بڑھنے لگی تو کسی خیال کے تحت رک گئی۔ یکبارگی دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر برآمدے کے فرش پر بیٹھ گئی۔ آنکھوں میں دنیا جہان کی دہشت بھر گئی، کراہنے کے سے انداز میں بولی، ''نہیں...... بیٹی...... خدا کے لئے یہیں سے ہی پلٹ جاؤ۔ اسی وقت یہ علاقہ چھوڑ دو...... پربت شاہ مری گیا ہوا ہے۔ افروز شاہ بندرہ میں ہے۔ ان کے آنے سے پہلے چلی جاؤ۔ میں کہتی ہوں، نہیں...... حکم دیتی ہوں کہ ان کے آنے سے پہلے پہلے اس ملک سے نکل جاؤ۔ وہ تمہارا خون کر دیں گے۔''

اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔ بولنے سے پیشتر ہی دونوں بہنیں دیوانہ وار چمٹ گئیں۔ خون کی کشش نے باؤلا کر دیا تھا۔ وہ اونچی آواز میں رو رہی تھیں اور اسے پاگلوں کی طرح چوم رہی تھیں۔ اسے بھی رونا آ گیا۔ بہ مشکل انہیں خود سے علیحدہ کر کے فرش پر ہتھیلیاں ٹکائے، آنکھیں پھاڑے بیٹھی چچی کے گلے میں بانہیں حائل کر کے بولی، ''آنٹی! فکر نہ کرو۔ وہ میرا خون نہیں کریں گے۔ میں نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا اور نہ ہی میں کسی کا نقصان کرنے آئی ہوں۔ میں تو آپ لوگوں کو زندگی میں ایک بار دیکھ لینے کی خواہش کے تحت آئی ہوں۔ ڈیڑھ ماہ بعد واپس چلی جاؤں گی۔ پھر وہ میرا خون کیوں کریں گے۔''

آنٹی نے پوری سختی کے ساتھ دائیں بائیں سر ہلایا، ہونٹ کاٹ کر بولی، ''تم پربت شاہ کو نہیں جانتی ہو۔ تم افروز شاہ سے بھی واقف نہیں ہو۔ بس! ان کے آنے سے قبل یہاں سے جان بچا کر بھاگ جاؤ۔''

وہ بولی، ''آنٹی! کہاناں، فکر مت کرو۔ مجھے کچھ نہیں ہوتا۔''

بڑی کزن کا نام ماہتاب تھا۔ پیار سے تابو کہا جاتا تھا۔ وہ ماں کے پہلو میں آبیٹھی، بولی، ”بی بی! آخر اس بے چاری کو بھائی اور بابا کیوں ماریں گے۔ یہ اتنی پیاری تو ہے......“

چھوٹی بیٹی کا نام نیلم بانو تھا۔ وہ پشت پر آ گئی۔ دونوں کندھے تھام کر بولی، ”بی بی! تابو ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے، ہم نے اپنی بہن کو دیکھ تو لیا۔ اٹھو آپی...... میرے کمرے میں چلو۔ میں تمہارے لئے چائے پانی کا بندوبست کرتی ہوں۔“

دونوں بہنیں اسے اپنی بانہوں میں لیے اپنے کشادہ کمرے میں لے گئیں جبکہ ماں وہیں مٹی کے ڈھیر کی صورت بیٹھی رہی۔ اس کی سانس حلق میں کہیں اٹک رہی تھی اور آنکھوں کے سامنے ہر شئے لحظہ بہ لحظہ سرخ ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ایسے میں افروز شاہ تیز تیز قدموں چلتا ہوا زنان خانے میں داخل ہوا۔ ماں کو فرش پر بیٹھے دیکھ کر جھٹ سے قریب آ گیا، پریشانی سے بولا، ”کیا ہوا بی بی!“

وہ کراہی، ”ہوا کچھ نہیں مگر بہت کچھ ہونے والا ہے۔“

ماں پر سے نظریں ہٹا کر اس نے اردگرد دیکھا۔ پوچھا، ”نوروز کہہ رہا تھا کہ کوئی انگریز لڑکی ادھر آئی ہے۔ ادھر تو نظر نہیں آ رہی۔ کہاں ہے؟“

وہ کئی ثانیے تک بیٹے کے چہرے کو ایک ٹک دیکھتی رہی۔ وہ گھبرا گیا۔ کندھے جھنجھوڑ کر بولا، ”بی بی! تمہیں آخر ہوا کیا ہے؟“ گھبرا کر اردگرد دیکھا۔ زور سے پکارا، ”گل زریں...... تابو...... بانو...... تم سب لوگ کدھر مر گئے ہو؟“

گل زریں اس کی بیوی کا نام تھا۔ اس کی دھاڑتی آواز سن کر کچن سے بھاگتی ہوئی نکلی۔ قریب آ کر ادب سے کھڑی ہو گئی۔ وہ بولا، ”گھر میں کون آیا ہے؟“

وہ حیرانی سے بولی، ”یہاں تو کوئی نہیں آیا...... یہ بی بی ایسے کیوں بیٹھی ہے؟“

وہ افروز شاہ کو نظر انداز کر کے بی بی کے پاس بیٹھ گئی۔ بی بی نے تھوک نگلا۔ ترحم طلب نظروں سے افروز کو دیکھا۔ بولی، ”افروز! میں تمہاری ماں ہوں۔ تمہیں میں نے دودھ پلایا ہے۔ آج اس دودھ کی بتیس دھاروں کی قیمت مانگتی ہوں۔ کیا دو گے؟“

اس کا چہرہ بھک سے اڑ گیا۔ بی بی کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ بولا، ”بی بی! میں پاگل ہونے لگا ہوں۔ یہ پہیلیاں مت بجھواؤ، صاف صاف کہو، کیا بات ہے۔“

بی بی کے پاس اسلحہ نہیں تھا۔ بیٹے کی طاقتور بانہوں کو روکنے کی سکت بھی نہیں تھی۔ مامتائی جذباتیت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس لیے جو تھا، اسے داؤ پر لگا دیا۔ اپنی شال اتار کر بیٹے کے قدموں میں پھینک دی، بولی، ”اس کی لاج رکھنا سید زادے...... میری سنبل کو کچھ مت کہنا۔ وہ پردیسن ہے۔ کچھ دن رہ کر واپس چلی جائے گی۔ وہ تم سے، تمہارے بابا اور بھائیوں سے، بہنوں سے صرف ملنے کے لئے آئی

ہے۔''

افروز شاہ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ کبھی بی بی کا چہرہ دیکھتا، کبھی پیروں میں پڑی سیاہ شال کی طرف نگاہ جاتی...... بی بی کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بولا، ''یہ سنبل کون ہے بی بی؟''

اس نے ہاتھ بڑھایا۔ بیٹے کے گھٹنے پر رکھ دیا۔ چہرہ اشکوں سے تر تھا۔ لہجے میں دنیا بھر کی لجاجت بھری ہوئی تھی۔ بولی، ''سنبل تمہارے چاچے نورنگ شاہ کی بیٹی ہے۔ ہمیں ایک نظر دیکھنے کے لئے ولایت سے آئی ہے۔ خون کی کشش باؤلی کو سندربن میں کھینچ لائی ہے۔''

''اوہ...... تو یہ جو انگریزن آئی ہے، وہ نورنگ شاہ کی بیٹی ہے؟'' افروز ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ آنکھوں میں لمحہ بھر کو خشونت رقصاں ہوئی پھر معدوم ہو گئی۔ لبوں پر بے عنوان مسکراہٹ ابھری اور بولا، ''اچھا! تو یوں کہو کہ چاچے نے ولایت میں شادی بھی کر رکھی ہے۔ کہاں ہے وہ؟...... میں بھی تو اپنے چاچے کی بیٹی کو دیکھوں۔ کیسی ہے؟...... پر بی بی! اس میں رونے کی کیا بات ہے؟''

بی بی اسے تشکیک آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ گود میں کھلایا تھا۔ رگ رگ سے شناسا تھی۔ بولی، ''افروز! وہ اندر بیبیوں کے کمرے میں ہے۔ پر دیکھ لینا...... تم نے یا تمہارے بابا نے اسے مارا تو میرا ابھی مرا ہوا منہ دیکھو گے۔''

افروز کا چہرہ ایک دم اسپاٹ ہو گیا۔ حیرت سے گنگ کھڑی گل زریں کو اچٹتی ہوئی نگاہوں دیکھا اور اپنی شال کندھے پر درست کرتا ہوا تابو اور بانو کے کمرے کی طرف تیز تیز قدموں چل پڑا۔ بی بی کے بدن میں جیسے بجلی بھر گئی تھی، تیزی سے اٹھی اور بھاگنے کے سے انداز میں اس کے پیچھے لپکی۔ دل میں خوف گھر کر چکا تھا۔ وہ اس پر توجہ دیے بغیر گلا کھنکار کر کمرے میں داخل ہو گیا جبکہ اس کی پشت پر بی بی دونوں چوکھٹیں تھام کر دروازے میں پتھر ہو گئی۔

وہ کمرے کے عین وسط میں جا کر رک گیا۔ بیڈ پر بیٹھی تینوں لڑکیاں کھڑی ہو گئیں۔ بی بی نے دیکھا کہ دونوں بہنوں نے غیر محسوس انداز میں سنبل کو اپنے عقب میں کر لیا تھا۔ افروز چند لمحوں تک سنبل کو بغور دیکھتا رہا پھر مسکرا کر بولا، ''اچھا! تو یہ انگریزنی میرے چاچے کی بیٹی ہے...... ادھر آؤ لڑکی! مجھ سے پیار تو وصول کر لو۔''

سنبل نے بیڈ پر سے چھلانگ لگائی۔ قریب آئی۔ عین مقابل میں سینہ تان کر کھڑی ہو گئی۔ دلچسپی آمیز نظروں سے دیکھنے لگی۔ ایسے میں ٹھٹک کر سوچنے لگی کہ پیار کیسے لیا جاتا ہے؟...... فوراً سمجھ میں آ گیا کہ اسے پیار لینے کا روائتی طریقہ نہیں آتا تھا۔

افروز اس کی حرکات کو بغور دیکھ رہا تھا۔ بولا، ''یہ کیا؟ ایسے پیار لیا جاتا ہے؟''

تابو سمجھ گئی۔ ساری عمر انگلینڈ میں رہنے والی کو سندربن کی روایات سے کیا کام تھا...... دونوں کے بیچ حائل ہوئی۔ سنبل کی طرف منہ کر

کے بولی، ’’غور سے دیکھو...... بڑوں سے ایسے پیار لیا جاتا ہے۔‘‘

تابو نے اسے دکھانے کے لئے اپنی شال درست کی، افروز کے پہلو میں آئی اور مودبانہ انداز میں اپنا سر جھکا کر بولی، ’’السلام علیکم لالہ جی!‘‘

سنبل نے تابو کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا۔ بولی، ’’مگر میرے پاس تو شال ہی نہیں ہے۔‘‘

بانو کی جلترنگ ہنسی عقب میں گونجی۔ ذرا تھم کر بولی، ’’تو کیا ہوا آپی؟ تمہارا سر تو ہے ناں جسے لالہ جی کے سامنے جھکایا جاسکتا ہے۔‘‘

اس نے جھینپ کر سر جھکا دیا۔ افروز نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھے۔ مخملیں بالوں کا لمس عجیب لگا۔ بولا، ’’تم بہت پیاری ہو...... سنبل...... تمہارا نام بھی بہت پیارا ہے۔ یقیناً چاچے نے رکھا ہوگا۔‘‘

اس نے سر اٹھایا۔ اپنے چچازاد کو بغور دیکھا۔ اس کے چہرے پر بیک وقت پیار اور درشتی ثبت تھی۔ بولی، ’’تم بھی بہت کیوٹ ہو۔ آئی لو یو......‘‘

’’تم اکیلی آئی ہو...... چاچا...... اور ماں...... یا کوئی بہن بھائی...... کسی کو تو ساتھ لاتیں ناں۔‘‘ افروز نے اس پر گہری نگاہیں مرکوز رکھتے ہوئے پوچھا۔

’’تم شاید نہیں جانتے...... پاپا اور ماما اس دنیا میں نہیں رہے۔ میرے بہن بھائی آپ لوگ ہی ہو، اور کوئی نہیں۔‘‘

’’اناللہ......‘‘ سبھی کے حلق سے یہی کلمہ برآمد ہوا۔

پربت شاہ کو حویلی پہنچنے سے پہلے ہی یہ خبر مل چکی تھی۔ اس کا رویہ بھی افروز شاہ سے ملتا جلتا تھا۔ گھر کے باہر افروز شاہ نے اسے روک کر کہا، ’’بابا! دل کی بات زبان پر آجائے تو بنا بنایا کھیل خراب ہوجاتا ہے۔‘‘

’’اچھا! تو اب تم مجھے سمجھاؤ گے کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا...... واہ افروز شاہ واہ......‘‘ پربت شاہ نے استہزائیہ انداز میں ہاتھ نچائے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا زنان خانے کی طرف بڑھ گیا۔

❀❀❀

وہ بولتے بولتے تھک کر خاموش ہوچکی تھی۔ احمد نے اب تک اس کے بیان میں دخل نہیں دیا تھا۔ اس کے خاموش ہونے پر آہستگی سے اٹھا۔ لائٹر ٹارچ آف کر کے جیب میں ڈالی اور دہانے کی طرف بڑھا۔ غار کے اندر اندھیرا بدستور مسلط تھا مگر اس کا طنطنہ پہلا سا نہیں رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ سیاہ پتھر اور درخت کے تنے کے درمیان بیٹھا ہوا وادی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ صبح ہوچکی تھی۔ اندھیرا چھٹ چکا تھا مگر پہاڑیوں کے دامن میں چکراتے ہوئے گہرے سیاہ بادلوں کی وجہ سے دھوپ نہیں نکلی تھی۔ کمزور اندھیرا طاری تھا اور سرد

ہواؤں کا راج بدستور قائم تھا۔

اس نے گردن نکال کر نیچے ندی میں جھانکا۔ پانی اچھلتا کودتا انجان منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سندر بن کی طرف اندھیرا دیکھ کر بڑبڑایا، ''ادھر ابھی تک بارش ہو رہی ہے۔''

چونکہ کھوہ کشادہ نہیں تھی اس لیے اس نے سنبل کی وجہ سے گریز کرتے ہوئے کافی دیر سگریٹ نہیں پی تھی۔ کھلی فضا میں پہنچتے ہی طلب جاگ اٹھی۔ اس نے پتھر سے ٹیک لگائی، سگریٹ نکال کر سلگائی اور گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔

وہ سردار خان کو نہیں جانتا تھا مگر پربت شاہ اور افروز شاہ کی سینہ زوریوں سے آگاہ تھا۔ اس نے گزشتہ رات کی ہولناکی اور سنبل کی بیان کردہ ادھوری کہانی سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ پربت شاہ کے لیے سنبل بہت قیمتی اور اہم ہے۔ سنبل کے بہ عافیت یہاں سے جانے پر اسے بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ سندر بن کی وادی اس کے زیرِ تصرف تو ہے مگر اس کی کامل ملکیت نہیں ہے۔ اس کے سر پر نور رنگ شاہ کی لٹکتی ہوئی تلوار عیاں ہوئی تھی۔ وہ اس تلوار کو توڑ کر ہمیشہ کے لئے اس خطرے کا گلا گھونٹ دینا چاہتا ہوگا۔ پانچ سال پہلے والے پربت شاہ کے پاس آٹھ دس نوکر تھے۔ جن میں سے نصف کے قریب اسلحہ بردار اور خونخوار مجرم تھے جنہیں اس نے پناہ دے رکھی تھی۔ آج اس کے پاس موجود نفری کی پوزیشن کیا تھی، اس کا احمد کو اندازہ نہیں تھا۔ دوسرا کردار سردار خان تھا۔ وہ کون تھا، کیسا تھا اور اس کے بازوؤں میں کتنا دم تھا...... اس بارے میں محض قیاس آرائی ہی کی جا سکتی تھی۔

دور دور تک کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دیا۔ اس طرف کسی کے آنے کا امکان بھی نہیں تھا۔ سندر بن جانے والی دونوں پختہ سڑکیں خاصے فاصلے پر واقع تھیں۔ اس نے جنوب کی جانب نگاہ دوڑائی۔ کوئی نصف فرلانگ کے فاصلے پر سندر بن کا سرحدی درہ واقع تھا۔ جہاں دونوں پہاڑیوں کے بیچ سے ندی گزر رہی تھی، وہاں سندر بن کی حد ختم ہو جاتی تھی۔ ایک کلومیٹر کی مسافت طے کرنے کے بعد یہ ندی اس سڑک کے نیچے سے گزرتی تھی جو گھوم پھر کر سندر بن آتی تھی۔ اسی سڑک پر احمد کی فور وہیل جیپ کھڑی تھی۔ بندرہ یا کالکوٹ کی طرف جانے کے لئے سندر بن کے پاس سے گزرنا پڑتا تھا جو احمد اور سنبل کے لیے ممکن نہیں تھا۔ یعنی سندر بن سے نکلنے کا فی الوقت یہی ایک راستہ تھا۔ احمد کو یقین کی حد تک شبہ تھا کہ پربت شاہ اور سردار خان کے کارندوں نے اس سڑک کو پوری طرح کور کر رکھا ہوگا۔ وہ اپنی یادداشت پر زور دے رہا تھا، کوئی اور راستہ کھوج رہا تھا مگر کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ جس پہاڑی کی کھوہ کے دہانے پر بیٹھا تھا، اس کے عین پشت پر ایک ناپختہ راستہ نکلتا تھا جو بالترتیب دو گیسٹ ہاؤسز، ایک تبلیغی مرکز اور کیڈٹ سکول کو چھوتا ہوا ایکسپریس روڈ کی طرف نکل جاتا تھا۔ اس شاہراہ سے اسے اسلام آباد یا مظفر آباد کے لئے کوئی نہ کوئی سواری میسر آ سکتی تھی مگر اس کی دانست میں اس پہاڑی کو عبور کرنا ممکن نہیں تھا کیونکہ کھوہ والی سمت میں پہاڑی کی تمام تر ڈھلان عمودی تھی۔

اسے بھوک لگ رہی تھی۔ جانتا تھا کہ سنبل کی حالت زیادہ خراب تھی۔ وہ بھوک اور نقاہت کا نسبتاً بڑا عذاب بھگت رہی تھی۔ کسی بھی لمحے گر سکتی تھی۔ ایسے میں احمد کی مشکلات میں اضافہ ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس دوران سیگرٹ ختم ہوگئی تھی۔ اس نے دوسری سلگا لی۔ خالی پیٹ سیگرٹ کا ذائقہ بھی کڑوا لگا۔ سیگرٹ کیس خالی ہونے والا تھا۔ یہ فکر اضافی تھا۔ اس نے ایک طویل سانس لی۔ زندگی کی طرف قدرے ناگواری سے دیکھا اور ہاتھوں کا بھونپو بنا کر بلند آواز میں بولا، ''سنبل! سنبل! کم آؤٹ......''

اس کی آواز سنبل تک پہنچ گئی۔ چند لمحوں بعد وہ بکری کی طرح چوپایا چلتی ہوئی باہر آ گئی۔ جونہی سیدھی ہوئی، احمد کی نگاہ اس کی گھسی ہوئی شرٹ پر پڑی۔ جلدی سے نظریں جھکا کر بولا، ''میں آنکھیں بند کرتا ہوں۔ تم شرٹ اتار کر اس کا اگلا حصہ پیچھے کر دو۔ پچھلا حصہ آگے آ جائے گا۔''

اس نے پتے کی بات کی تھی۔ سنبل بڑبڑائی، ''اتنی سامنے کی بات میری سمجھ میں کیوں نہیں آئی؟''

اس نے شرٹ اُتاری۔ چور نظروں سے احمد کو دیکھا۔ وہ آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ شرٹ کو جلد از جلد پہننے کی کوشش میں تاخیر ہونے لگی۔ سٹپٹائی۔ ایسے میں دل دھڑکنے لگا۔ سوچنے لگی، 'یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟...... میں شرٹ اتارتے اور پہنتے ہوئے بار بار احمد کی طرف کیوں دیکھ رہی ہوں جبکہ اس کی آنکھیں بند ہیں۔ میں نے آج تک ہر معاملے کو عملی انداز میں دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ آج زندگی میں ایسے فضول سے خیالات کیوں داخل کر رہی ہوں؟''

اس نے شرٹ پہن لی۔ احمد نے درست کہا تھا۔ سینہ اور پیٹ چھپ گئے تھے۔ کمر ننگی ہو رہی تھی۔ خیر تھی۔ بولی، ''چلیں......''

احمد نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے دیکھا۔ بظاہر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر پہلے دیکھا ہوا منظر ٹی شرٹ کے میلے کپڑے پر ثبت تھا۔ اس نے جلدی سے رخ پھیر لیا۔ سیگرٹ کا کش لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا رخ نیچے کی طرف تھا۔ چند قدم چل کر اسے پہلے کی طرح سنبل کی کمر میں بازو حائل کرنا پڑا۔ ناگاہ پتہ چلا کہ رات بھر موت کے ڈر سے خاموش رہنے والا سنبل کا بدن بولنے لگا تھا۔

ایسے میں اس کے چہرے پر نظر پڑی۔ وہ بھی اس ثانیے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کھوہ سے نکلتے ہوئے پانی پیا تھا۔ ہونٹوں تک چہرے کا حصہ گیلا اور صاف تھا۔ نصف بالائی حصہ میلا تھا مگر اس کی رنگت کی تاب کو چھپا نہیں رہا تھا۔ الٹا مہمیز کر رہا تھا۔ حسن توازن سے پیدا ہوتا ہے۔ توازن ترتیب کا دوسرا نام ہے۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے اور شانوں پر بے ترتیبی سے پھیل رہے تھے مگر دیکھنے والے کے دل کو گدگدا گئے۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا، ''سنبل! تم تو قتل کر دینے والا حسن رکھتی ہو؟''

وہ چونکی، ''یہ قتل کر دینے والا حسن کیا ہوتا ہے؟''

وہ مسکرایا، ''جسے دیکھنے والا دوسری سانس نہ لے سکے۔''

وہ جھینپ سی گئی، بولی، ’’مگر تم تو لمبی لمبی سانسیں لے رہے ہو۔‘‘

وہ بولا، ’’تم اسے اپنی یا میری بدبختی کہہ سکتی ہو کیونکہ مجھے اس وقت اپنی اور تمہاری جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ سڑک کی طرف جانا ناگزیر ہے۔ سڑک پر تمہارے دشمنوں سے ہونے والا ٹکراؤ بھی تصور میں انگارے بھر رہا ہے۔‘‘

سنبل کا دل دھک سے رہ گیا۔ چند لمحوں کے لئے سر پر لٹکتی ہوئی موت کے بھیانک خیال سے پلو چھوٹا تھا۔ احمد کی بات سنتے ہی دل پھر ہولناک اندیشوں سے بھر گیا۔ گھبرا کر بولی، ’’میں اس علاقے سے واقف نہیں ہوں۔ تم ہی بہتر فیصلہ کر سکتے ہو کہ ہمیں کیسے یہاں سے نکلنا ہے۔‘‘

احمد نے اس کے چہرے پر تناؤ دیکھا۔ سنبھل گیا۔ اسے سنبھالنے کے لئے بولا، ’’تم بڑی خودغرض ہو۔‘‘

وہ اس کا اشارہ سمجھ گئی۔ جواب نہ پا کر چپ رہی۔ اس نے اب تک ایک بار بھی احمد سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر اپنے گھر چلا جائے۔ وہ محض سنبل کی وجہ سے خون کی ہولی میں شامل ہوا تھا۔ کچھ سوچ کر بولی، ’’میں سمجھ رہی ہوں جو تم کہنا چاہتے ہو اور کیوں مجھے خودغرض قرار دے رہے ہو..... مگر میں کیا کروں؟ اگر تمہیں گھر جانے کا کہوں اور تم چلے جاؤ تو میں ان پتھروں میں سر پھوڑ پھوڑ کر مر جاؤں گی۔ کبھی سنڈرلینڈ نہیں پہنچ پاؤں گی۔‘‘

دونوں ایک پتھر کے ساتھ چپک کر کھڑے تھے۔ احمد کو اس کے چہرے پر تاسف اچھا نہ لگا۔ اس کا گال تھپتھپا کر بولا، ’’ڈونٹ بی وری..... میں تمہیں چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ کہا تھا ناں کہ ائرپورٹ پر پہنچا کر ہی پلٹوں گا۔‘‘

اس نے ممنونانہ نظروں سے اسے دیکھا، بولی، ’’تم بہت اچھے ہو احمد..... میں کبھی بھی تمہیں نہیں بھول پاؤں گی۔‘‘

احمد کے لبوں پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ ناچی پھر معدوم ہو گئی۔ اسے نرمی سے دھکیلنے لگا۔ کھوہ تک آنا مشکل تھا۔ کھوہ سے ندی کی طرف اترنا اس سے بھی کہیں زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اترتے تک احمد بری طرح ہانپنے لگا۔ ندی کے کنارے پر ابھرے ہوئے پتھر پر بیٹھ گیا۔ یخ پانی پیا۔ سینے میں درد کی لہر اٹھی۔ ہاتھ سینے پر رکھا۔ مسلا۔ کچھ دیر تک بیٹھا لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا پھر کھڑا ہو گیا۔

سنبل ندی پر جھکی ہوئی پائن کی ایک شاخ تھام کر کھڑی تھی۔ بولی، ’’کیا ہمیں پانی کے رخ پر جانا ہے؟‘‘

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اونچے نیچے پتھروں پر بڑی احتیاط سے چلنے لگا۔ ایسے ہی وقت میں ماحول پر چھائی ملگجی بھی روشنی کم ہونے لگی۔ دونوں نے بے ساختہ اُوپر دیکھا۔ بادلوں نے دونوں پہاڑیوں کا بالائی نصف حصہ چھپا دیا تھا۔ چند ہی منٹوں میں بادلوں نے انہیں چھونا شروع کر دیا۔ سردی کم ہو گئی۔ نمی زیادہ ہو گئی۔ احمد نے اطراف میں نظر دوڑائی۔ بارش سے بچنے کے لئے محفوظ جگہ دکھائی نہ دی تو مایوسی سے بولا، ’’ہم گیلے ہو جائیں گے۔‘‘

سنبل نے جلدی سے دو تین جگہوں کی نشاندہی کی۔ احمد نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے زیادہ وقت درکار تھا۔ بولا، ’’ہمارے پاس ایک کوٹ ہے۔ لگتا ہے کہ اس کی قربانی بھی دینا پڑے گی۔‘‘

وہ اس کا مطلب نہیں سمجھی مگر خاموش رہی۔ ایسے میں پھوار گرنے لگی۔ پانی کے سرد قطرے اچھے لگے۔ جب ان قطروں کی بہتات ہونے لگی تو سنبل پر کپکپی طاری ہوگئی۔ احمد نے ایک طویل سانس لی۔ کوٹ سے متصل کیپ کھینچی اور سر پر اوڑھا دی۔ ایک بڑے مستوی پتھر پر رک کر کوٹ کے بٹن کھول دیے۔ جونہی بارش تیز ہوئی، اس نے کوٹ کے دونوں پلو کھولے اور سنبل کو کوٹ کے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ایک قدم کا فاصلہ حائل تھا۔ ایک لمحے میں...... یا ایک صدی میں طے کیا جا سکتا تھا۔ اس نے احمد کی آنکھوں میں جھانکا اور قدم بڑھا دیا۔ احمد نے اسے کوٹ میں چھپا لیا اور اس کے گرد بانہیں حائل کر کے کوٹ کے بٹن بند کر دیے۔ کوٹ کے اندر کا موسم بے حد گرم تھا جس نے اسے آنِ واحد میں گرما دیا۔

پولیس کی نوکری نے اس کے اعصاب سخت کر رکھے تھے مگر اس تربیت کی تمام تر فولادیت اس آنچ پر اپنا آپ برقرار نہیں رکھ پا رہی تھی۔ بدن کے ساتھ ساتھ اعصاب بھی پگھل رہے تھے۔ احمد نے کہا، ’’اپنے پائنچے چڑھا لو۔ ندی کا پانی اٹھ رہا ہے۔‘‘

تیز بارش کے ساتھ ہوا کے تیز تھپیڑے برساتی پانی کو مسلسل اچھالا دے رہے تھے۔ جونہی سنبل نے اپنے پائنچے چڑھانا چاہے، احمد کے اور قریب ہوگئی۔ اس سے زیادہ قربت کیا ہوتی ہے؟...... اس سوال کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔ کوٹ نے انہیں بھیگنے سے بچا لیا تھا مگر دم بدم پانی جذب کر کے بھاری ہو رہا تھا۔ غضب ہوا کہ جس پتھر پر دونوں کھڑے تھے، اس پر ندی پانی اچھالنے لگی تھی۔ احمد بولا، ’’پانی بہت ٹھنڈا ہے۔ میں نے جاگرز پہنے ہوئے ہیں۔ تم ننگے پیر ہو۔ اپنے دونوں پیر اوپر اٹھا لو۔‘‘

پتھر سرد تھا۔ پانی سرد تر تھا۔ بے چارگی سے بولی، ’’مگر کیسے؟‘‘

احمد کا نچلا ہونٹ اوپری ہونٹ پر چڑھ گیا۔ بولا، ’’یہ تمہاری پرابلم ہے، تمہی کو حل کرنا ہوگی۔‘‘

بچپن میں سنبل اپنے پاپا کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر، دونوں گھٹنے موڑ کر لٹک جایا کرتی تھی۔ پاپا اسے گھماتے تھے۔ اسے یہ عمل بہت اچھا لگتا تھا۔ یاد آ گیا۔ اس نے کوٹ کے اندر سے احمد کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھے۔ اپنا پورا وزن ڈالا۔ جب محسوس ہوا کہ وہ اس کا وزن اٹھا سکتا ہے تو اس نے دونوں گھٹنے موڑ لیے۔ پاپا کا لمس اور تھا۔ احمد کا لمس اور...... دل کی دھڑکن یکبارگی بڑھ گی۔ زمین سرد تھی۔ فضا میں آگ لگی ہوئی تھی اور آسمان اندھا تھا...... زندگی عجیب تفسیریں بیان کرتی ہے۔ کوئی سمجھ میں آتی ہے، کوئی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے۔ جس کی سمجھ نہ آئے، اسے جنوں کہا جاتا ہے۔ اس کیفیت کو بھی دل والوں نے جنوں کا نام دے رکھا ہے۔

احمد پر ایک ہی وقت میں اس کا بوجھ گراں بھی تھا اور دل افروز بھی، بولا، ’’تمہاری دھڑکن بہت تیز ہو رہی ہے۔ تم ٹھیک تو ہو؟‘‘

وہ کچھ نہ بولی۔ ماما کہا کرتی تھی کہ جھوٹ بولنے سے خاموش رہنا بہتر ہوتا ہے اور خاموشی سے آنکھیں بند کر لینا بہتر ہوتا ہے۔اس نے آنکھیں بند کر لیں۔احمد نے اپنا سوال دہرایا۔وہ قدرے بھاری آواز میں بولی،''میں ٹھیک نہیں ہوں مگر مجھے تمہاری ہارٹ بیٹ کیوں محسوس نہیں ہو رہی؟''

بارش کا شور بہت بڑھ گیا تھا۔وقت زیادہ گزر گیا۔احمد کے پاؤں نہیں تھکے،سنبل کے ہاتھ تھک گئے۔بولی،''احمد! میں تھک گئی ہوں۔''

''اوہ......میرے دونوں پاؤں گھٹنوں تک بھیگے ہوئے ہیں۔جاگرز پانی سے بھر گئے ہیں۔اگر تم نے پاؤں سیدھے کیے تو ٹھٹھر جاؤ گی۔یقیناً تم اپنے پیروں پر کھڑی نہیں ہو پاؤ گی۔''

احمد کو احساس تھا کہ محض باتوں سے سنبل کے ہاتھوں کی توانائی بحال نہیں ہوگی۔اس نے اپنی بانہیں نیچی کیں۔گھٹنوں سے کچھ اوپر بانہوں کا شکنجہ بنایا اور سانس روک کر سنبل کو اوپر اٹھا لیا۔وہ کوئی چھ انچ اوپر اٹھی۔اس کا سر کوٹ سے باہر نکل آیا۔کچھ دیر بعد احمد نے اسے بتا کر ہاتھ کھول دیے۔تھک گیا تھا۔زیادہ دیر ہاتھوں پر وزن نہیں لے سکتا تھا۔ایسے ہی وقت جب کوٹ کے اندر اور باہر موسم کی دونوں انتہائیں عروج پر تھیں،بارش رک گئی۔بادل بدستور اپنی جگہوں پر قابض رہے۔چند منٹوں کے بعد ندی کا پانی پتھر سے اتر گیا تو احمد نے کوٹ کے بٹن کھول دیے۔وہ اپنے پیروں پر لحظہ بھر ٹکی اور پھر نیچے بیٹھ گئی۔اس نے اپنا سر گھٹنوں میں ڈال دیا اور احمد کے کئی بار مخاطب کرنے پر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

احمد نے کوٹ اتارا۔اس کی جیبوں سے سامان نکال کر قمیص کی جیبوں میں ٹھونسا اور اسے ندی کے پانی میں اچھال دیا۔چونکہ وہ بہت بھاری ہو گیا تھا،اس لیے اسے پہن کر چلنا ممکن نہیں رہا تھا۔کوٹ کے گرنے کی آواز سن کر بھی سنبل نے سر نہیں اٹھایا تو احمد کو تشویش لاحق ہوئی۔اس کے سامنے یا پہلو میں بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔گھوم کر عقب میں آیا،پیروں کے بل پتھر پر بیٹھا اور سنبل کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا،''نہیں سنبل! ابھی تھکنا نہیں......ابھی بہت لمبا سفر طے کرنا باقی ہے۔''

اس نے سر نہیں اٹھایا،اس کے ایک ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا،آہستگی سے بولی،''میں ٹھیک ہوں۔مجھے چند منٹ دے دو۔اونلی فیو منٹس......''

تھکی تھکی روشنی میں خاصی دور تک دکھائی دینے لگا تھا۔وہ بری طرح تھک گیا تھا۔بھوک اور خنکی سے سر میں درد ہونے لگا تھا۔سر درد کی ایک وجہ سر اور پیشانی پر لگنے والی چوٹیں بھی تھیں۔شکر تھا کہ پاؤں کی موچ کو آرام آ گیا تھا ورنہ چلنا دوبھر ہو جاتا۔چند منٹ بعد اس نے سنبل کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور پتھروں پر احتیاط سے آگے بڑھنے لگا۔آدھے گھنٹے میں انہوں نے تین چار مرتبہ تھک کر قیام کیا۔

آخر درختوں کے بڑے جھگھٹے کے عین درمیان میں واقع ایک بڑے پتھر کے پاس پہنچ کر احمد رک گیا۔ بتانے لگا، ''ہم سڑک پر پہنچ آئے ہیں۔ سڑک دکھائی نہیں دے رہی مگر میں جانتا ہوں کہ اس پتھر کے پار سڑک کا نشیبی موڑ ہے۔''

وہ اپنی سانسیں ہموار کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ بولا، ''آگے بار بار چڑھائی آتی ہے۔ ہماری حالت ایسی نہیں کہ ہم پیدل چلتے ہوئے مری روڈ تک پہنچ سکیں۔ اس لیے ہمیں یہاں انتظار کرنا ہوگا۔ جونہی کوئی گاڑی ادھر آئی، میں سڑک پر جا کر اس سے لفٹ مانگوں گا۔''

''کیا ادھر کوئی گاڑی آئے گی؟'' وہ نیم مایوسی سے بولی۔

''توقع رکھنا تو اچھا عمل ہے ناں؟'' اس کے انداز سے لگا کہ وہ بھی زیادہ پرامید نہیں تھا۔

دس پندرہ منٹ تک بیٹھے رہنے کے بعد اچانک سنبل چونک گئی۔ کان لگا کر بولی، ''آواز آ رہی ہے۔ شاید کوئی گاڑی ہو......''

احمد نے اپنی قوتِ سماعت آزمائی پھر ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا، بے اختیار اٹھتی ہوئی سنبل کے کندھے پر ہاتھ رکھا، بولا، ''نہیں...... تم یہیں بیٹھی رہو۔ میں اکیلا جاؤں گا۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ احمد نے ڈانٹ دیا۔ وہ لاچارگی کی تصویر بن کر ڈھے گئی۔ کچھ نہیں ہوا تھا مگر دل خوف سے دھڑکنے لگا تھا۔ احمد درختوں کے بیچ پتھر کا چکر کاٹ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ چند لمحوں بعد سڑک کے کنارے ایستادہ فلک بوس درخت کے پیچھے کھڑا سڑک کے دونوں اطراف دیکھ رہا تھا۔

اس کے سامنے سڑک کا خطرناک موڑ تھا۔ یہاں سے گزرنے والی ہر گاڑی کی رفتار نہایت کم ہوتی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ واقع اس پہاڑی کی چوٹی پر اس کی جیپ کھڑی تھی۔ بائیں ہاتھ پر منزل واقع تھی۔ کانوں پڑتی آواز قریب آ رہی تھی۔ کوئی گاڑی سندربن کی جانب سے آ رہی تھی۔ اس کے اعصاب تن گئے۔ چونکہ پربت شاہ کے علاوہ سندربن کے کسی شخص کے پاس گاڑی نہیں تھی، اس لیے آنے والا پربت شاہ کا آدمی ہو سکتا تھا۔ احمد اس سے لفٹ نہیں لے سکتا تھا۔ احمد نے جیب سے پسٹل نکالا۔ اس کا بغور جائزہ لینے کے بعد بولٹ چڑھایا اور سیفٹی لاک ہٹا دیا۔

اچانک سامنے آنے والی جیپ نوے ماڈل کی اوپن لینڈ روور تھی۔ یہ یقینی طور پر پربت شاہ کی جیپ نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اسے کھلی چھت والی جیپیں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔ جیپ کے وسطی حصے میں موٹا آہنی پائپ نصب تھا جس پر تیز بیم لائٹس لگی ہوئی تھیں۔ اس پائپ کو تھامے دو افراد کھڑے تھے۔ ایک نے سیاہ ملیشیا کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی جبکہ دوسرے کا بالائی دھڑ نیلے رنگ کے کوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ احمد نے ان کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی گنیں پہلی نظر میں دیکھ لی تھیں۔ ڈرائیور نے لانگ کوٹ پہن رکھا تھا جبکہ پسنجر سیٹ

خالی تھی۔ تیز پیلے رنگ کی چار بیم لائٹس موٹے پائپوں والے بمپر پر بھی نصب تھیں۔ لمحہ بھر کو احمد پر خوف غالب آیا پھر اچانک درخت کی اوٹ سے نکل کر بھاگتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ اس نے غیر ارادی طور پر پسٹل والا ہاتھ پیچھے کر لیا تھا۔

موڑ کی وجہ سے جیپ کی رفتار بہت کم تھی۔ ڈرائیور نے بریک لگا دیے۔ جیپ میں کھڑے ہوئے دونوں گن برداروں نے اسے فی الفور نشانے پر لے لیا۔ کوٹ والا مقامی لہجے میں بولا، ''اوئے! تم کون ہو اور ادھر کیا کر رہے ہو؟''

وہ رکی ہوئی جیپ کے عین سامنے کھڑا تھا۔ بولا، ''میں پنجاب سے آیا ہوں۔ سیر و تفریح کے لئے۔ ادھر میری گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ تم نے یقیناً اوپر والے موڑ پر اسے کھڑا دیکھا ہوگا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا، اچھل کر جیپ سے اترا اور اس سے چند قدموں کے فاصلے پر آ کر رک گیا۔ اس نے اپنی گن کا رخ احمد کے سینے کی طرف کیا ہوا تھا۔ بولا، ''اچھا! تو وہ تمہاری گاڑی ہے..... کیا تم اسے ایک طرف کھڑا نہیں کر سکتے تھے؟ سڑک کے بیچ کھڑی کر کے راستہ بند کر دیا تم نے۔ پہاڑی علاقے میں آنے سے پہلے ڈرائیوری بھی سیکھ لیتے ناں!''

اس کے لہجے میں گہری کاٹ تھی۔ اس کا ساتھی جو چاق چوبند حالت میں جیپ میں کھڑا تھا، دبنگ لہجے میں بولا، ''الو کے پٹھے! دھکا لگا کر ایک طرف کرنے میں ہمیں..... پر بھی پسینہ آ گیا۔ کیا اپنی ماں کو سائیڈ پر نہیں کر سکتے تھے؟''

وہ ٹھیٹھ پنجابی تھا۔ لہجہ خاصا جارحانہ تھا۔ احمد نے خون کا گھونٹ حلق میں اتار کر نرمی سے کہا، ''میں اکیلا تھا، بڑی گاڑی کو دھکیل نہیں سکا۔''

اس کے مقابل جیپ کے ہڈ کے پاس کھڑا ہوا گن بردار بڑی گہری نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ سرتاپا تنقیدی جائزہ لے کر بولا، ''اب تم کیا چاہتے ہو؟ اور تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟''

احمد موقع کی تلاش میں تھا جو اسے نہیں مل رہا تھا۔ بولا، ''مجھے لفٹ چاہیے۔''

دونوں گن برداروں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ پنجابی بولا، ''تم نے ادھر کسی لڑکی کو دیکھا ہے؟''

اس نے حیرانی سے کہا، ''اس موسم میں لڑکی کا ادھر کیا کام؟......''

ڈرائیور نے تیز لہجے میں کہا، ''یار یہ سوال جواب چھوڑو، اسے پرے ہٹاؤ، ابھی ہمیں سارے علاقے کا گشت کرنا ہے اور اس گشتی کو تلاش کرنا ہے۔ اسے نجانے پہاڑ کھا گئے ہیں یا آسمان......''

کوٹ والا گن بردار احمد کے ہاتھ والا قضیہ بھول گیا۔ الٹے پیروں پیچھے ہٹتے ہوئے بولا، ''ہٹ جاؤ جوان......''

اس نے قدم بڑھایا، جلدی سے بولا، ''مگر مجھے بھی ساتھ لے جاؤ نا.....ادھر قصبے میں اتار دینا.....''

ڈرائیور نے اس کی بات گویا سنی ہی نہیں۔گاڑی بڑھادی۔وہ چھلانگ لگا کر روڈ سائیڈ پر پہنچا۔جونہی جیپ اس کے برابر پہنچی،اس نے ایک درخت کے پیچھے چھلانگ لگادی۔موڑ کاٹتی ہوئی جیپ میں اپنی جانب پشت کیے کھڑے گن برداروں کی طرف پسٹل کی نال کا رخ کیا اور ٹرائیگر دبا دیا۔ٹھائیں کی زوردار آواز کے ساتھ ہی کوٹ والا ایک جھٹکے سے پائپ سے الگ ہوا۔کمر کے بل پہلے جیپ کی باڈی سے ٹکرایا پھر قلابازی کھا کر سڑک پر جا گرا۔اس کی گن ایک لمحے کے لئے احمد کو نظر آئی پھر سڑک کے کنارے کی طرف لڑھک کر غائب ہوگئی۔

وہ بری طرح تڑپ رہا تھا۔احمد نے بھانپ لیا تھا کہ اس کے سر کے عقبی حصے میں گولی نے سوراخ کر دیا تھا۔دوسرا گن بردار فوراً جیپ کے اندر بیٹھ گیا تھا۔اس کا سر جیپ کی باڈی سے کچھ اوپر تھا۔احمد نے دوسرا نشانہ لیا۔چاہا کہ فائر کرے مگر اس دوران جیپ موڑ مڑ گئی۔وہ نشانے سے باہر ہوگیا۔احمد نے جست بھری اور لمحہ بھر میں روڈ کے ڈھلوانی کنارے پر تڑپتے ہوئے گن بردار کو جالیا۔اس کا بدن آخری جھٹکے لے رہا تھا اور منہ سے ڈراؤنی خرخراہٹ برآمد ہورہی تھی۔اس کا ایک نظر جائزہ لینے کے بعد احمد نے کنارے پر اُگی جھاڑیوں میں چھلانگ لگادی۔ایسے ہی وقت میں ماحول فائرنگ کی خوفناک آوازوں سے گونج اٹھا۔پنجابی بولنے والے گن بردار نے اس درخت کی طرف برسٹ مارا تھا جس کے نیچے احمد چند لمحے قبل موجود تھا۔درختوں کے علاوہ کئی گولیاں اس پتھر پر بھی لگیں جس کے عقب میں سنبل دبکی بیٹھی تھی۔

احمد کے پیروں میں جیسے برق بلا کوند گئی تھی۔اس نے جھاڑیوں میں پہنچتے ہی خود کو زمین سے چپکا دیا۔پھر گردن موڑ کر نیچے سڑک کی جانب دیکھا۔جیپ موڑ سے کوئی دس بیس گز آگے جا کر رک گئی تھی۔خالی تھی۔گن بردار اور ڈرائیور دکھائی نہیں دے رہا تھا۔وہ یا تو جیپ کی آڑ میں تھے یا کسی پتھر کے پیچھے مورچہ زن ہوگئے تھے۔سڑک تقریباً پچاس گز کے بعد پھر موڑ لیتی تھی اور نظروں سے اوجھل ہوجاتی تھی۔یہ چھوٹی سی وادی جس کے عین وسط میں بہت بڑی کھائی تھی،کارزارِ جنگ میں تبدیل ہوچکی تھی۔گن بردار نے برسٹ مارنے کے بعد کچھ دیر خاموشی اختیار کی پھر اکا دکا فائر کرنے لگا۔وہ احمد کو دیکھ نہیں سکا تھا اور نہ ہی اس کی پوزیشن کا بہتر اندازہ کرنے میں کامیاب ہو پایا تھا۔تین چار فائر کرنے کے بعد اعصاب شکن سناٹا طاری ہوگیا۔

احمد کھائی کی طرف کھسکا۔نیچے دیکھا۔وہ کھائی کو عبور کر کے جیپ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔جیپ تک پہنچنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ موڑ کاٹتی ہوئی سڑک کے ڈھلانی کنارے پر کھسکتا ہوا اس طرف جائے۔یہ بہت خطرناک تھا کیونکہ اس کا مورچہ زن دشمنوں کی نظر میں آجانا یقینی تھا۔چھپکلی کے مانند چپکے رہ کر کھسکنے کے دوران وہ اپنا بچاؤ نہیں کرسکتا تھا۔چند لمحوں بعد اس نے سڑک کے مخالف کنارے کی جانب سے گن بردار کو دیکھ لیا۔وہ درختوں کے بیچ چلتا ہوا اپنے ساتھی کی لاش کی طرف بڑھ رہا تھا۔وہ درختوں کی اوٹ لے رہا تھا۔

رک رک کر چل رہا تھا۔احمد کی سانس رکنے لگی۔اگر وہ چند قدم اور آگے بڑھتا تو سنبل کو دیکھ لیتا۔اس سے بعید نہیں تھا کہ وہ اسے گولی مار دیتا۔مگر اس کے پاس اسے روکنے کا کوئی چارہ نہیں تھا۔وہ اس کے پسٹل کی رینج سے باہر تھا۔اگر اس کا راستہ روکنے کے لئے جھاڑی سے نکلتا تو اس کی شعلے اگلنے کو بے تاب گن کا نشانہ بن جاتا۔ایسے میں اس کی مدھم سی بڑبڑاہٹ ابھری،''نہیں یار! باہر نہیں نکلنا......اللہ مالک ہے......اب جو بھی ہوگا، دیکھا جائے گا۔''

اب وہ عین اس جگہ پر پہنچ چکا تھا جہاں سے احمد کے اندازے کے مطابق اسے سنبل کو دیکھ لینا چاہیے تھا۔یہی ہوا، سنبل اسے نظر آ گئی۔اس نے خون آشام انداز میں غلیظ گالی دی اور غرا کر کہا،''اے! اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آؤ۔تم میرے نشانے پر ہو۔''

اس قماش کے لوگ ایسے ہی لب و لہجے سے دہشت پھیلا کر اپنا آدھا مقصد حاصل کر لیتے ہیں۔وہ ڈر گئی۔ہاتھ سر پر رکھے سامنے آ گئی۔احمد ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔بولا،''شِٹ یار! گیم ہی الٹی پڑ گئی۔''

وہ موڑ کی طرف کھسکا۔ڈرائیور کی طرف سے خطرہ لاحق تھا۔وہ دکھائی نہیں دیا تھا۔اس کے پاس اسلحے کا ہونا یقینی تھا۔دونوں کا ایک ساتھی قتل ہو چکا تھا۔ان کے رگ وپے میں بھرے ہوئے غصے کو پیشِ نظر رکھ کر آگے بڑھنا تھا۔تبھی بڑی احتیاط سے کھسک رہا تھا۔ایسے ہی وقت اسے 'چٹاک' کی زوردار آواز سنائی دی۔اس نے سر نکالا۔سنبل کی طرف دیکھا۔گن بردار نے زوردار چانٹا سنبل کے گال پر رسید کیا تھا۔وہ گالیاں دے رہا تھا اور اسے بری طرح دہشت میں مبتلا کر کے پوچھ رہا تھا کہ اس کا ساتھی کہاں گیا جس نے جیپ پر فائر کیا تھا۔وہ 'نہیں، نہیں' کا راگ الاپ رہی تھی۔اس کا دوسرا تھپڑ کھا کر وہ پتھر کے پیچھے زمین پر گری۔اسے پکڑنے کے لئے گن بردار نے قدم بڑھایا۔جوش کی حالت میں درخت کی اوٹ سے نکلنے کی غلطی اسے بہت مہنگی پڑی۔وہ احمد کے پسٹل سے نکلنے والی گولی کی زد میں آ گیا۔گولی نے اس کا کندھا چھید دیا تھا۔جب تک سنبھلتا، دوسری گولی پہلو کے رخ دل میں اتر گئی۔اگلا قدم اختیار سے نکل گیا اور وہ پہلو کے بل ایک درخت سے ٹکرایا۔گن کا رخ احمد کی طرف کیا مگر ٹرائیگر نہ دبا سکا۔گن چھوٹ گئی۔ہاتھ سینے پر جا پہنچا۔'ہاہ' کی لمبی صدا لگا کر درخت کی جڑ میں بیٹھ گیا۔سخت جان تھا۔یکبارگی گن اٹھا کر کھڑا ہوا۔احمد کی جانب رخ کیا۔تین چار گولیاں جھونک دیں۔احمد نے سر نیچے کر لیا۔چوتھے فائر پر احمد کے عقب میں دردناک چیخ ابھری جو فائر کی خوفناک آواز کے جلو میں اپنی بازگشت چھوڑ گئی۔پلٹ کر دیکھا۔کچھ نظر نہ آیا۔اسی دوران موت سے لڑنے والا بازی ہار گیا۔اس کے ہاتھ میں گن جھول گئی اور وہ کراہتا ہوا زمین پر گر گیا۔اس کی جان بڑی ظالمانہ ادا سے نکل رہی تھی اور اسے بری طرح تڑپا رہی تھی۔منٹ بھر کے بعد وہ ساکت ہو گیا۔احمد کو اس کی طرف سے اطمینان ہو گیا مگر عقب میں ابھرنے والی چیخ نے بے چین کر رکھا تھا۔بجا طور پر کوئی جیپ کے قریب چھپا ہوا تھا جسے گولی لگی تھی۔وہ زندہ تھا، بے ہوش یا مردہ......اس بارے میں احمد فوری طور پر کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکتا تھا۔

ایسے ہی وقت میں سنبل دکھائی دی۔ وہ گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی لاش کے قریب پہنچی۔ اس نے گن مردہ ہاتھ سے نکال لی۔ پھر الٹے قدموں کھسک کر پتھر کے عقب میں چلی گئی۔ احمد کو اس کی یہ حرکت بھلی لگی۔ پہلی مرتبہ اس نے بہادری کا مظاہرہ کیا تھا ورنہ اب تک وہ روایتی لڑکیوں کی طرح تعجب، خوف اور دہشت کا اظہار کرتی آئی تھی۔ اس کی کسی بھی ادا سے نہیں لگتا تھا کہ وہ سٹڈر لینڈ پولیس کی اسسٹنٹ سارجنٹ تھی۔

احمد سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ ایسے میں سنبل چھلانگ لگا کر اس درخت کے عقب میں پہنچی جس کی جڑ میں لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس نے ماہر نشانہ بازوں کی طرح پوزیشن لی اور گن نکال کر جیپ کی طرف فائر کیا۔ دو تین فائر کرنے کے بعد تھم گئی۔ سامنے آ گئی۔ بلند آواز میں بولی، ''احمد! تم کہاں ہو؟''

وہ چیخا، ''میں ادھر ہوں۔''

''آ جاؤ، تینوں مر چکے ہیں۔'' سنبل سڑک کے بیچ آ کر رک گئی۔ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ احمد کہنیوں کے بل سڑک پر چڑھا اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ استعجاب آمیز لہجے میں مستفسر ہوا، ''تمہیں کیسے پتہ چلا کہ جیپ میں تین افراد تھے؟''

وہ بولی، ''جب تم یہاں کھڑے تھے تو میں نے جھانک کر جیپ کو دیکھ لیا تھا۔ جب میں گن اٹھا کر پلٹی تو میں نے تیسرے حرامزادے کو جیپ کی نیچے لیٹے دیکھا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ بھی مر چکا ہو۔ میں نے صرف تسلی کی خاطر اس پر فائر کیے تھے۔''

احمد نے اس کا ہاتھ پکڑا اور جیپ کی طرف تیزی سے بڑھا، ''میرا خیال ہے کہ فائرنگ کی آواز سندر بن تک پہنچی ہو گی۔ ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہو گا۔''

یہ کہتے ہی وہ دوڑنے لگا۔ سنبل کو گن کی وجہ سے دوڑنے میں دقت ہو رہی تھی مگر ایسے تیسے بھاگ رہی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ جیپ کے پاس تھے۔ سنبل کا اندازہ درست تھا۔ جیپ کے نیچے لیٹا ہوا شخص زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔ اس کے عین دل کے مقام پر سینے میں سوراخ ہو چکا تھا جس سے بھل بھل کرتا ہوا گاڑھا خون نکل کر سڑک پر جوہڑ بن رہا تھا۔

احمد نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ سنبل اچھل کر پسنجر سیٹ پر بیٹھ گئی۔ چابی اگنیشن میں تھی۔ وہ چابی گھما کر بولا، ''نہیں سنبل...... تم پیچھے چلی جاؤ۔ ابھی ہمارے سر سے خطرہ نہیں ٹلا۔ گن کو فائرنگ پوزیشن میں رکھنا۔''

وہ دونوں سیٹوں کے بیچ سے گزر کر عقب میں چلی گئی۔ جیپ کا انجن بیدار ہو گیا۔ احمد نے ایک جھٹکے سے ایکسی لیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ گاڑی کا عقبی ٹائر لاش پر چڑھ کر اترا جس کی وجہ سے جیپ کو بدترین جھٹکا لگا۔ وہ جلد از جلد سامنے والا موڑ عبور کر لینا چاہتا تھا تاکہ عقب سے آنے والے شکاریوں کی رینج سے فی الوقت نکل جائے۔ اگلے منٹ میں وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے

اپنی تمام تر توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رکھی تھی کیونکہ اسے معلوم تھا اس خطرناک سڑک پر سرزد ہونے والی غلطی کا انجام بہت بھیانک تھا۔ کوئی تین چار کلومیٹر کا سفر طے کرنے کے بعد اس نے ایک "U" شکل کا موڑ کاٹتے ہی خطرناک انداز میں بائیں ہاتھ واقع درے میں جیپ ڈال دی۔ بادی النظر میں یہ راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ادھر سڑک نہیں تھی مگر آٹھ دس فٹ ناپختہ راستہ پہاڑی کے دامن کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا درختوں کے ایک جھنڈ میں گم ہو جاتا تھا۔ اچھلتی ہوئی جیپ کے خطرناک انداز میں جھٹکے لیتے اسٹیئرنگ ویل پر اس کے ہاتھ اس مضبوطی سے جمے ہوئے تھے کی پشت کی رگیں ابھر آئی تھیں۔ سنبل کی لرزتی ہوئی آواز کانوں میں پڑی، ”یہ ہم کدھر جا رہے ہیں احمد؟“

وہ بولا، ”یہ راستہ مشکل ضرور ہے مگر ہمارے لیے خطرناک نہیں ہے۔ ایک لمبا چکر کاٹ کر ہم ایکسپریس روڈ پر جا نکلیں گے۔“

وہ راستوں کا بھید نہیں جانتی تھی۔ مخل نہیں ہوئی۔ پوچھنے لگی، ”کیا میں سیٹ پر آ جاؤں؟ ادھر بہت جھٹکے لگتے ہیں۔“

اس نے 'اوہ یس' کہا تو وہ سیٹوں کے درمیان سے گزر کر فرنٹ سیٹ پر آ گئی۔ یہ راستہ نہ صرف زگ زیگ تھا بلکہ خاصا اونچا نیچا اور غیر ہموار تھا۔ جنگل بہت گھنا تھا۔ راستے کے دونوں طرف سر بفلک درخت ایستادہ تھے۔ بعض جگہوں پر راستہ اتنا تنگ ہو جاتا تھا کہ احمد کو جیپ روک کر گزرنا پڑتا تھا۔ وہ سیٹ پر برائے نام بیٹھے تھے جبکہ عملی طور پر اچھل کود رہے تھے۔ سنبل بے ساختہ جھلا کر چیخ پڑی، ”ہائے احمد! میری پسلیاں پھٹنے کو آ گئی ہیں۔ روک دو اسے......“

اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔ جیپ روکی نہ رفتار کم کی۔ انہیں ابھی تک اطراف میں کوئی گھر دکھائی دیا تھا نہ ہوٹل...... تا حدِ نگاہ درخت، پہاڑی ناہمواری اور پتھر...... کوئی چار کلومیٹر چلنے کے بعد اس بدن شکن راستے سے دائیں ہاتھ نسبتاً تنگ راستہ نکلتا دکھائی دیا۔ احمد نے جیپ روکی۔ چند لمحے سوچا، پھر اسٹیئرنگ گھما دیا۔ ایک نیم دائروی موڑ کاٹتے ہی ایک سرخ ڈھلانی چھت والی مختصر سی عمارت دکھائی دی۔ راستہ اس کے عین بیرونی برآمدے کے سامنے جا کر پتھریلی پورچ کی شکل اختیار کر گیا۔ جیپ روک کر احمد نیچے اترا۔ اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور بھاگتا ہوا برآمدے میں داخل ہو گیا۔ سنبل کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ عمارت خالی ہو۔ کوئی ذی نفس نظر آ رہا تھا نہ کوئی آواز ابھر رہی تھی۔

احمد مرکزی دروازے کے سامنے چند منٹ رک کر پلٹا۔ جیپ تک آیا۔ عقبی حصے میں سے ایک راڈ اٹھا کر دروازے پر گیا۔ چند لمحوں میں اس نے قفل توڑ دیا اور اندر گھس گیا۔ اس کی واپسی پانچ منٹ کے بعد ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں راڈ کے بجائے ایک سفید اور نیلے رنگ کا شاپنگ بیگ اور منرل واٹر کی دو بوتلیں دبی ہوئی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اس نے شاپنگ بیگ سیٹوں کے درمیانی خلا میں رکھ دیا جبکہ پانی کی بوتل سنبل کو تھما دی۔ وہ بولی، ”یہ کیا ہے؟“

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ جیپ کو ریورس کیا۔ پھر اسٹیئرنگ گھما کر واپسی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اسی راہ پر تھا جس سے اتر کر اس نے عمارت کا رخ کیا تھا۔ سنبل متجسس تھی مگر شاپنگ بیگ میں جھانک کر دیکھنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ پانی زیادہ ٹھنڈا تھا۔ دو چار گھونٹ بمشکل پیا گیا۔ احمد سے باتیں کرنا چاہتی تھی مگر اس کی بے محابا سنجیدگی کے سبب خاموش بیٹھی سکرین کے پار دیکھنے لگی۔ کچا راستہ ایک ٹوٹی پھوٹی پختہ سڑک پر اختتام پذیر ہوا تو سنبل کی جان میں جان آئی۔ اچانک احمد نے بریک لگا دیے۔ بولا،

''یہ شاپنگ بیگ اٹھاؤ اور اس پتھر کے پیچھے چلی جاؤ۔ اس میں کپڑے ہیں۔ کوئی وقت ضائع کیے بغیر پہن لو۔ اس میں جوتے بھی ہیں۔ ہری اپ!''

سنبل نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ کچھ پوچھنا چاہا مگر احمد نے موقع نہ دیا۔ کہا، ''ڈونٹ ویسٹ دی ٹائم پلیز......اور یہ گن بھی ساتھ لیتی جاؤ۔ اسے وہیں چھوڑ دینا۔''

اس نے شاپنگ بیگ اور گن اٹھائی اور جیپ سے اتر کر پتھر کے پیچھے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آئی تو اس کی جون بدل چکی تھی۔ سرخ کڑھائی دار بھاری قمیص، سفید شلوار اور باریک سٹریپس والے شوز......اس نے ہاتھوں میں شال بھی تھام رکھی تھی۔ بولی،

''اس کا کیا کروں؟''

''اسے اوڑھ لو۔ اگر نقاب کرنی آتی ہے تو نقاب بھی کر لو۔ تمہیں تلاش کرنے والے دھوکہ کھا جائیں گے۔'' احمد نے اسے دلچسپی آمیز نظروں سے دیکھا۔ یہ لباس سنبل کے مزاج کا حصہ نہیں تھا۔ وہ پہن لینے کے بعد بری طرح نروس ہو رہی تھی۔ جھجک رہی تھی۔ اس نے اپنی چچا زاد بہنوں کی شالیں دیکھ رکھی تھیں۔ ان کے سراپاؤں کو نظر میں رکھ کر شال اوڑھنے کی کوشش کی۔ کامیاب نہیں ہوئی تو سر پر ٹکا کر دونوں ہاتھوں میں تھامے سیٹ پر آ بیٹھی۔ بولی، ''میں نے اپنا لباس وہیں پھینک دیا ہے۔ اور ہاں! یہ شال مجھے پہنا دو۔''

اس نے شال کے دونوں پلو تھامے۔ چاہا کہ چہرے پر لپیٹ دے۔ سرخ رنگ کی ستاروں بھری شال نے چہرے کی رنگت کے ساتھ ایسا کنٹراسٹ دیا کہ وہ دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ ایسے ہی ٹکٹکی باندھ کر کئی لمحے گھورتا رہا۔ وہ جھینپ گئی۔ بولی، ''کیا ہوا؟ ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟ کیا میں نے کوئی غلطی کر لی ہے؟''

اس نے پلو چھوڑ دیے۔ سگرٹ کیس سے آخری سگرٹ نکال کر سلگائی، ایک لمبا کش لیا اور گیئر لیور پش کر دیا۔ بولا، ''بس ایسے ہی ٹھیک ہے۔''

وہ کچھ سمجھی، کچھ نہ سمجھی مگر اپنے جوتوں کو دیکھنے لگی۔ پیروں کو تنگ کر رہے تھے مگر آنکھوں کو بھلے لگ رہے تھے۔ جونہی جیپ آگے بڑھی، اس نے پوچھا، ''احمد! تم صرف یہ لباس لینے کے لئے اس عمارت میں چوروں کی طرح داخل ہوئے تھے؟''

احمد نے کہا، ''چوروں کی طرح نہیں، ڈاکوؤں کی طرح کہو۔ میرا اندازہ تھا کہ وہاں سے کچھ کھانے پینے کے لیے مل جائے گا۔ نہیں ملا۔''

''وہ کسی کا گھر ہے؟''

''ہاں! وہ ایک فیملی ریسٹ ہاؤس ہے۔ سرگودھا کے ایک بڑے زمیندار کی ملکیت ہے۔ وہ گرمیوں کے دو چار ماہ اپنی فیملی سمیت یہاں آکر رہتا ہے۔ باقی سارا سال یہاں پر ایک چوکیدار رہتا ہے جو اس عمارت کا خیال رکھتا ہے۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کڑاکے کی سردی میں وہ بھی کہیں جا کر دبکا بیٹھا ہوگا۔ عمارت خالی ملی۔ اس کی ایک الماری میں مجھے دو تین زنانہ سوٹ دکھائی دیے۔ جوتے بھی مل گئے۔ میرے پہننے کے لیے وہاں کچھ نہیں تھا، نہ پیٹ میں ڈالنے کو کچھ تھا ورنہ اٹھالاتا۔''

''مگر تم نے یہ کیوں کیا؟''

''تم بے وقوف بھی ہو۔ اوئے عجیب وغریب سارجنٹ! اُس لباس میں مین روڈ پر چڑھتے تو ہر کوئی دیدے پھاڑ پھاڑ کر تجھے دیکھتا۔ پولیس دھر لیتی۔ تمہیں کوئی کچھ نہ کہتا، میری درگت بن جاتی۔ اتنی سامنے کی بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتی۔'' اس نے بظاہر غصے سے کہا مگر سنبل کو اچھا لگا۔ 'تھینک یو' کہہ کر باہر دیکھنے لگی۔ چند ہی لمحوں میں وہ ایک دورویہ کشادہ سڑک پر تھے۔ احمد نے بتایا کہ یہ پنڈی سے مظفر آباد جانے والی مرکزی شاہراہ ہے۔ اس نے یہ بھی تسلی دی کہ اب وہ پربت شاہ اور سردار خان کی رینج سے باہر نکل چکے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد احمد نے ٹال پلازے کے برابر پہنچ کر روڈ سائیڈ میں جیپ روک دی۔ اسے اترنے کا اشارہ کیا پھر ساتھ لے کر سڑک عبور کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد وہ مری روڈ پر کھڑے تھے۔ سنبل نے پوچھا، ''اب کیا ارادہ ہے؟''

احمد کی حالت بہتر نہیں تھی مگر اس نے مسکرا کر دیکھا۔ کہا، ''اب تم آزاد ہو۔ کیا تمہیں کسی ٹیکسی پر بٹھا کر اسلام آباد روانہ نہ کردوں؟''

وہ گھبرا گئی۔ جلدی سے بولی، ''نہیں احمد...... تم مجھے ایسے نہیں چھوڑ سکتے ہو۔ پلیز...... فار گاڈ سیک...... میرے ساتھ چلو۔ تم نے کہا تھا......''

''کہ تمہیں ائرپورٹ پر چھوڑ کر آؤں گا۔ ہیں؟'' احمد نے چھیڑنے کا سا لہجہ اختیار کیا۔ ایسے میں ٹال پلازے سے نکلتی ہوئی ویگن پر نگاہ پڑ گئی۔ قدم بڑھا کر ہاتھ لہرانے لگا۔ ویگن رک گئی۔ ان کے بیٹھنے پر چل پڑی۔ کنڈیکٹر کے استفسار پر احمد نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پرس سے ایک نوٹ کھینچا اور کہا، ''بارہ کہو......''

کنڈیکٹر نے اسے کریدتی نگاہوں دیکھا مگر کچھ کہے بغیر کرایے کی رقم کاٹی اور بقایا اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بارہ کہو کے موڑ پر کھڑے تھے۔ احمد اسے لیے چند میٹر ویگن کے پیچھے چلا پھر بائیں ہاتھ گلی میں مڑ گیا۔ سڑک بلند تھی۔ گلی بتدریج پستی میں جا

رہی تھی۔ایک موڑ مڑنے کے بعد عین سامنے والی عمارت پر ہوٹل کا بورڈ آویزاں دیکھ کر سنبل کے حلق سے طویل سانس خارج ہوگئی۔ وہ احمد کی تمام تر پلاننگ سمجھ گئی تھی۔اس نے گاڑی کو ایکسپریس وے پر چھوڑ کر اس سے جان چھڑائی تھی اور اب کچھ کھانے پینے اور آرام کرنے کے ارادے سے ہوٹل کا رخ کیا تھا۔ایک گھنٹہ انہی امور میں گزر گیا۔احمد بھرپور انگڑائی لے کر بیڈ پر دراز ہوگیا۔بولا،''سوری سنبل!میں نے کاؤنٹر پر تمہیں اپنی بیگم لکھوایا۔اگر ایسا نہ کرتا تو کاؤنٹر مین ہمیں کمرہ نہ دیتا۔''

سنبل قالین پر بیٹھ گئی۔بیڈ کے ساتھ کمر لگا کر بولی،''یہ معذرت خواہانہ بات نہیں ہے۔میں سمجھتی ہوں کہ تم نے بہ امرِ مجبوری جھوٹ بولا ہے۔''

''اب تم کافی بہتر حالت میں ہو۔پیٹ بھر جائے تو انسان کو بہت کچھ سوجھتا ہے۔تم بھی اپنے دماغ پر زور ڈالو اور اپنا آگے کا لائحہ عمل طے کرو۔عملی طور پر میرا کام ختم ہوگیا ہے مگر میں چاہوں گا کہ تم پھر پربت شاہ کے ہاتھ نہ لگ جاؤ۔بتاؤ......تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہو؟''

''احمد!میں نے تمہیں کھوہ میں اپنی کہانی سنائی تھی۔وہ مکمل نہیں تھی۔میں چاہتی ہوں کہ اسے مکمل کروں تاکہ تم میری مدد کر سکو۔مجھے بہتر مشورہ دے سکو۔''

احمد نے کچھ کہنا چاہا مگر دروازے پر دستک ہوئی۔احمد کے اشارے پر سنبل نے دروازہ کھولا۔روم سروس مین تھا۔سیگرٹ کیس دینے آیا تھا۔سنبل نے کیس لے کر دروازہ مقفل کر دیا۔احمد نے سیگرٹ نکال کر سلگائی،لائٹر کو پیار سے دیکھا اور بڑبڑایا،''تم کتنے پیارے ہو۔تم نے رات بھر ساتھ دیا ورنہ کوئی لمحہ بھر ساتھ نہیں دیتا۔تم میرے سینے میں دھواں بھرتے تھے،رات کو روشنیاں بھرتے ہو۔''

سنبل بڑی محویت سے احمد کو دیکھ رہی تھی۔اس نے کھانے سے قبل غسل کیا تھا۔دھلا دھلا چہرہ دل کو بھا رہا تھا۔وہ'ایوریج'میں شامل نہیں تھا۔'اسپیشل لسٹ'میں تھا۔اس نے کن اکھیوں سے سنبل کی محویت تاڑ لی۔مسکرایا۔بولا،''مجھ سے متاثر ہو رہی ہو؟''

وہ جب سے احمد کو ملی تھی،پہلی مرتبہ کھلکھلا کر ہنسی۔آنکھیں جذبات خیز انداز میں چندھیا کر اسے دیکھتی رہی پھر بولی،''ہاں!تم بہت اچھے ہو۔آئی کیئر اباؤٹ یو......''

اسے سنبل کا یوں دیکھنا اچھا لگا۔ایک ٹک اسے دیکھتا رہا۔دیسی لباس اس پر قیامت کی طرح جچ رہا تھا۔طویل کش پھیپھڑوں میں اتار کر بولا،''تم اپنی آپ بیتی مکمل کرنے جا رہی تھیں......''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔چند لمحے آنکھیں موند کر کچھ سوچتی رہی پھر بجلی کے سوئچ بورڈ پر نظریں جما کر بولنے لگی۔سلسلہ کلام وہیں

سے جوڑا، جہاں اس نے چھوڑا تھا......

❀❀❀

آنے والے دو تین دنوں میں ایسا لگا کہ افروز شاہ اور پربت شاہ کو اس کے کوئی واسطہ نہ تھا۔ انہوں نے اسے اتنی اہمیت بھی نہیں دی تھی کہ دوسری مرتبہ مل لیتے یا اس سے نورنگ شاہ کے بارے دریافت کر لیتے۔ البتہ حویلی کی خواتین نے اسے خصوصی پروٹوکول دیا۔ خوب آؤ بھگت کی۔ دو دن ایسے ہی گزر گئے۔ اس دوران تابو نے اسے حویلی، سندر بن اور بندرہ کے بارے میں بہت سی کارآمد باتیں بتائیں۔ اس نے منشیات فروشی، سردار خان اور چیئر لفٹ کے منصوبے کے بارے میں بھی خاصی باتیں بتائیں۔ زریں گل کچھ مختلف مزاج کی مالک تھی۔ وہ زیادہ گھلی ملی نہیں مگر اس نے خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔

وہ حویلی سے باہر نکل کر سندر بن کی سیر کرنا چاہتی تھی۔ چٹان کے نیچے پناہ گزین لوگوں سے ملنا چاہتی تھی۔ اس خواہش کا اظہار اس نے تیسرے دن آنٹی سے کیا۔ وہ چاہتی تھی کہ تابو اور بانو اس کا ساتھ دیں مگر آنٹی نے یہ کہہ کر اسے پریشان کر دیا، ''تمہارے انکل نے حکم دے رکھا ہے کہ تم حویلی سے باہر نہیں جاؤ گی۔''

''مگر کیوں؟ وہ یہ حکم کیوں کر دے سکتے ہیں؟'' سنبل نے دریافت کیا۔

''میں بیاہ کر آئی تھی تو مجھے یہی حکم ملا تھا۔ آج تک اس پر عمل کر رہی ہوں۔ تمہاری دونوں بہنوں کے لئے بھی یہی قانون رائج ہے۔ ظاہر ہے، تم بھی باہر نہیں جا سکو گی۔'' آنٹی کے لہجے میں یاسیت تھی۔

وہ اٹھی۔ کچھ کہے بنا بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ پربت شاہ مہمان خانے میں تھا۔ وہ اس کے پاس جانا چاہتی تھی مگر دروازے کے عین سامنے کھڑے گن مین نے روک دیا، ''بی بی! تم گھر سے باہر نہیں جاؤ گی۔''

''کیوں؟'' اس نے قدم نہیں روکے۔

وہ عین سامنے آ گیا۔ قدرے سخت لہجے میں بولا، ''بی بی! مجھے شاہ سائیں نے حکم دے رکھا ہے۔ میں تمہارا دل سے احترام کرتا ہوں مگر مجبور ہوں۔ مجھے امتحان میں مت ڈالو۔''

وہ رک گئی، بولی، ''میں شاہ سائیں کے پاس جا رہی ہوں؟''

''ادھر مہمان آئے ہیں۔ تم واپس جاؤ۔ میں شاہ سائیں کو بتا دیتا ہوں۔ وہ زنان خانے میں آ کر تم سے مل لے گا۔'' گن مین کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ کسی بھی قیمت پر سنبل کو حویلی سے نکلنے نہیں دے گا۔ وہ بھڑک گئی۔ اسے ایک جانب دھکیل کر تیز تیز قدموں سے مہمان خانے کی طرف بڑھی۔ گن مین اس کے ساتھ ساتھ دوڑتا آیا۔ اسے روکنے کی کوشش کرتا رہا مگر وہ نہ رکی۔ گن مین کسی خوف کے

مارے اسے چھونے سے گریز کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مہمان خانے میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگئی۔ سامنے پربت شاہ اپنے احباب کے دائرے میں بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر جھٹکے سے کھڑا ہوا۔ تیزی سے اس کے پاس آیا اور تحکمانہ انداز میں بولا ''تم ادھر کیوں آئی ہو؟''

اس نے کہا، ''اس نے مجھے دروازے پر کیوں روکا انکل؟ یہ کہہ رہا ہے کہ میں حویلی سے باہر نہیں جا سکتی۔''

پربت شاہ نے پلٹ کر مہمانوں کی طرف دیکھا۔ پھر گن مین کو گھورا۔ بولا ''یہ انگلینڈ نہیں ہے سنبل بیٹی...... یہ سندر بن ہے۔ یہاں عورتوں کا باہر نکلنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اور پھر اس لباس میں...... ناممکن...... تم حویلی کے اندر جاؤ۔''

وہ اڑ گئی، ''نہیں بابا! میں یہاں حویلی میں قید ہونے کے لئے نہیں آئی۔''

''تو کیا کرنے آئی ہو؟'' پربت شاہ چونکا۔

''میں اپنا علاقہ دیکھنے آئی ہوں۔ میں باہر جا رہی ہوں۔''

''نہیں...... تم ابھی گھر جاؤ۔ شام کو افروز خان آ جائے گا۔ وہ تمہارے ساتھ جائے گا۔ تمہیں سارا علاقہ دکھلائے گا۔''

شام کو آنے والا عین اسی وقت پہنچ گیا۔ مہمان خانے کے باہر گاڑی رکنے کی آواز ابھری۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ افروز شاہ دو گارڈز کے ہمراہ مہمان خانے کی طرف بڑھا۔ باپ کو سنبل کے ساتھ کھڑے دیکھ کر غصے سے بولا ''یہ یہاں کیا کر رہی ہے بابا؟''

پربت شاہ نے اس پر خفگی بھری نگاہ ڈالی اور کہا، ''یہ سندر بن کی سیر کرنا چاہتی ہے۔ حویلی میں اس کا دم گھٹنے لگا ہے۔''

اس کے لہجے میں طنز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ سنبل کا ماتھا ٹھنکا۔

افروز شاہ نے گارڈز کو دور جانے کا اشارہ کیا اور کڑک دار لہجے میں اسے کہا، ''مہمانوں کے سامنے ہمیں تماشا نہ بناؤ، حویلی چلو، وہاں تم سے بات ہوگی۔''

اس نے سنبل کے جواب کا انتظار کیے بغیر اسے بانہہ سے تھاما اور تقریباً گھسیٹتا ہوا مہمان خانے سے نکل گیا۔ چند لمحوں میں بی بی تک پہنچا کر بولا، ''بی بی! اسے سنبھال کر رکھو۔ اگر یہ دوبارہ باہر نکلی تو میں تمہارا خیال بھی نہیں کروں گا۔''

بی بی کی زبان مقفل رہی۔ اسے تھام کر تابو کے کمرے میں لے گئی۔ سمجھانے لگی کہ وہ ان لوگوں کے بارے غلط اندازے نہ لگائے۔ وہ انسانوں کی کھال میں درندے ہیں جو اسے چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔ وہ اس کا پینٹ شرٹ میں باہر نکلنا کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کریں گے۔

وہ خاموش ہوگئی۔ فیصلہ کن انداز میں بات کرنے کے لئے پر تولنے لگی۔ پھر موقع مل ہی گیا۔ رات کو کھانے پر سبھی کی موجودگی میں

پربت شاہ سے مخاطب ہوئی، ''انکل! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

وہ چونکا۔ اسپاٹ لہجے میں بولا، ''کیا بات ہے؟''

''یہاں کچھ ایسے کام ہو رہے ہیں جو خاندان کی بے عزتی کا سبب بن رہے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ ہمارے خاندان کو معتبر رہنا چاہیے۔'' اس نے ادب کا دامن تھامے رکھا تھا۔

پربت شاہ کا جبڑا بھنچ گیا۔ بولا، ''میں کچھ سمجھا نہیں۔ ایسا تو کوئی کام نہیں ہو رہا۔ سندر بن ہماری وادی ہے۔ ہم جو چاہیں، کریں۔ کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کسی کو اعتراض ہے تو وہ یہاں سے چلا جائے۔''

افروز نے یکے بعد دیگرے باپ اور سنبل کی طرف دیکھا۔ درشتی سے بولا، ''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

بی بی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سنبل کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ نظر انداز کر کے بولی، ''پہلی بات تو یہ ہے کہ سندر بن میں منشیات کا کاروبار کھلے عام ہو رہا ہے۔ اس معاملے میں علاقے بھر میں یہ وادی بدنام ہو چکی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سردار خان نامی شخص کا یہاں کوئی کام نہیں ہے مگر وہ بندرہ کی حویلی پر نہ صرف قابض ہے بلکہ اس نے غنڈوں کی ایک فوج پال رکھی ہے۔''

اس نے سانس لینے کے لئے توقف کیا۔ افروز نے سرد لہجے میں پوچھا، ''اور کچھ؟''

''انکل! آپ لوگوں نے دادا کے زمانے سے بیٹھے ہوئے لوگوں کے مکان گرا کر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ وہ بے چارے اس سردی میں گھر اور گھروں کا سامان گنوا کر چٹان کے نیچے بے آسرا پڑے ہیں۔ اگر چیئر لفٹ اور کیبل کار کا منصوبہ اتنا ہی فائدہ مند نظر آ رہا تھا تو اس کے لئے بندرہ وادی بھی موجود تھی جو سندر بن سے زیادہ سرسبز ہے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ درختوں کی کٹائی کا زیادہ رجحان یہاں پر ہے، بندرہ میں نہیں ہے۔''

افروز کا ضبط دیدنی تھا۔ اسے کڑی نظروں سے گھورتا رہا، پھر بولا، ''تم وہ بات کہو، جو کہنے کے لئے ولائت سے یہاں آئی ہو۔ گھما پھرا کر باتیں کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

اس نے انکل اور افروز کی شعلہ اگلتی آنکھوں کی پروا نہیں کی بلکہ حتمی انداز اختیار کیا، ''میں چاہتی ہوں کہ جس طرح دادا کے زمانے میں وادی کا نظام چلتا تھا، ایسے ہی اب بھی چلے۔ یہاں کوئی غیر قانونی دھندا نہ ہو جس سے وادی کی بدنامی ہو اور غریبوں کا خیال رکھا جائے۔ اگر آپ لوگ کسی بھی وجہ سے مجبور ہیں تو اپنے دھندوں کو بندرہ تک محدود کر دیں۔''

پربت شاہ اس لہجے اور اندازِ تخاطب کا عادی نہیں تھا۔ بھڑک کر بولا، ''خاموش رہو ورنہ......''

افروز نے ہاتھ بڑھایا۔ پربت شاہ کے فرطِ اشتعال سے کپکپاتے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ سنبل سے مخاطب ہوا، ''تمہارا ان معاملات

سے کیا تعلق ہے؟''

وہ بولی،''یہ وادی میری ہے۔اس سے بڑا تعلق کیا ہوگا؟''

''ہوں.....تو یہ وادی تمہاری ہے؟''افروز کی آواز بے حد درشت ہوگئی۔وہ پختہ کار نہیں تھی وگرنہ تیور سمجھ کر خاموش ہو جاتی۔بولی، ''یقیناً......اور میں اپنے بابا کا نام بدنام ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔اگر آپ لوگ میری بات پر توجہ نہیں دیں گے تو میں اپنی جائیداد اپنی تحویل میں لینا چاہوں گی۔''اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

اس کا جملہ بم کی طرح کھانے کی میز پر پھٹ گیا۔پربت شاہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔افروز شاہ کی آنکھیں فرطِ حیرت سے کھل گئیں۔حیرت کی جگہ رفتہ رفتہ اشتعال لینے لگا۔ان میں سے کسی کو بھی اس مطالبے کی توقع نہیں تھی۔بی بی کا ہاتھ دل پر جا ٹکا۔یہ مشکل خیر مانگی تھی۔خیر ہوتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔شا کی نظروں سے سنبل کی طرف دیکھا۔رحم طلب انداز میں اپنے شوہر اور بیٹے کو دیکھا۔نادان نہیں تھی۔سمجھ گئی کہ اب اسے سنبل کا دکھ دیکھنا پڑے گا۔

''اچھا!تو تم اس چکر میں یہاں آئی ہو......''افروز نے استہزائیہ انداز میں کہا،''بی بی!سن لیا ناں......تم نے کہا تھا کہ یہ اپنے خونی رشتوں کو ایک نظر دیکھنے آئی ہے۔نورنگ شاہ جیسے بے وفا شخص کے خون میں اتنا دم کہاں کہ پلٹ کر دیکھے۔اوئے لڑکی!کان کھول کر سن لو۔یہ ہمارے باپ دادا کی دھرتی ہے۔اس کے ہم وارث ہیں۔تم نہیں۔میرے بازوؤں میں اتنا دم ہے کہ تم جیسے کیڑوں مکوڑوں کو مسل کر رکھ دوں۔مگر بی بی کی وجہ سے تمہیں اب تک برداشت کرتا آیا ہوں مگر اب نہیں کروں گا۔آئندہ اگر تم نے حویلی سے باہر قدم رکھنے کی کوشش کی یا اپنی گندی زبان سے ہماری جائیداد کا نام لیا تو بہت برا ہوگا......اتنا برا کہ تم نے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔''

بات بڑھ گئی تھی۔بی بی نے ہمت دکھائی۔سنبل کو بازو سے پکڑ کر کمرے میں لے گئی۔سمجھانے لگی۔اپنی مجبوری اور کمزوری کا اظہار کرنے لگی،''سنبل!تم میرا نہیں،انہی لوگوں کا خون ہو مگر ان سے واقف نہیں ہو۔انہوں نے نورنگ شاہ کا ورقہ خاندان کی کتاب سے پھاڑ پھینکا ہے۔ویسے بھی یہ لوگ عورتوں کو وراثت میں سے حصہ دینے کے عادی نہیں ہیں۔خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ۔تم نے بتایا تھا کہ تمہارے پاس بہت دولت ہے۔جاؤ،اس پر عیش کرو۔سندربن کا خیال دل سے نکال دو ورنہ یہ ظالم لوگ تمہاری چھاتی سے دل نکال کر کتوں کے آگے ڈال دیں گے۔''

وہ بی بی کے سامنے خاموش ہو گئی مگر پربت شاہ اور افروز کے ردعمل سے ڈرنے کے بجائے ضد پکڑ گئی۔اگلے دن اس نے حویلی سے باہر جانے کی ضد کی۔افروز نے اسے اپنی جیپ میں بٹھایا،نوری نامی ایک گن مین کو ساتھ لیا اور آدھے دن کا بھرپور وزٹ دیا۔اس دوران سنبل نے اسے اپنے موقف پر قائل کرنے کی کوشش کی مگر اس نے اپنا کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا بلکہ سنی ان سنی کرتا رہا۔جب سہ پہر

میں واپسی ہوئی تو اس نے جیپ سے اترنے سے قبل کہا، ''لالہ! دیکھو تو سہی..... کتنا پیارا گاؤں آباد ہوا کرتا تھا یہاں جسے آپ لوگوں نے چند روپوں کے لالچ میں تہس نہس کر کے رکھ دیا۔''

افروز کے لبوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ثبت ہوگئی۔ کچھ بولنے کے بجائے آنکھوں سے سمجھانے لگا، 'تم اپنی زندگی سے دشمنی کرنے لگی ہو سنبل بی بی..... ابھی بھی وقت ہے، پلٹ جاؤ ورنہ اس کی مہلت بھی نہیں ملے گی۔'

وہ جس کمیونٹی کی پروردہ تھی، وہاں ایسی جنگیں قلم، قانون اور دلیل سے لڑی جاتی تھیں۔ اسے تین دن بعد پتہ چلا کہ وہ کتنی کمزور تھی۔ وہ تابو کے کمرے میں سوئی تھی۔ بیدار ہوئی تو ایک دم اچھل پڑی۔ وہ ایک نامانوس کمرے کے سالخوردہ بیڈ پر پڑی تھی۔ سیاہ پتھروں کی بنی ہوئی دو دیواریں اسپاٹ تھیں۔ باقی دو میں چوبی دروازے نصب تھے۔ وہ بھاگ کر سامنے والے دروازے میں آئی۔ دروازہ کھولا، کھل گیا مگر وہ بجلی کی سی تیزی سے پلٹی۔ یہ باتھ روم تھا۔ دوسرے دروازے میں آئی۔ دل دھک سے رہ گیا جب دروازے کو باہر سے مقفل پایا۔ حلق کے بل زور سے چیخی۔ ایک بار..... دو بار..... پھر بارہا..... کافی دیر بعد دروازے پر قدموں کی آہٹ ابھری۔ دروازہ کھول کر، ہاتھوں میں ٹرے میں تھامے اندر داخل ہونے والا خاصا بدصورت تھا۔ اس کی آواز بھاری اور ڈراؤنی تھی۔ بولا، ''شور نہ کرو۔ میں ناشتہ لے آیا ہوں۔ خاموشی سے کھالو۔''

اس نے بہت کچھ پوچھا۔ بہت چیخی چلائی۔ مگر ناشتہ لانے والے کی صحت پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے ٹرے میز پر رکھی، اسے دکھانے کے لئے ارادتاً ایک چمکدار خنجر نکال کر بلٹ بیلٹ میں اڑسا اور کہا، ''ادھر غسل خانہ ہے۔ پانی ختم ہو جائے تو بتا دینا۔ جب بھوک لگے، کھانا کھالینا۔ میں جا رہا ہوں۔ تم نے جو کچھ پوچھنا ہے، وہ شاہ سائیں سے پوچھنا۔ وہی بتائے گا۔''

''اسے بلاؤ..... میں ابھی پوچھتی ہوں اس سے۔'' وہ دانت پیس کر بولی۔

''وہ شام کو آئے گا۔'' اس نے کہا اور چلا گیا۔ اپنے پیچھے دروازہ مقفل کرنا نہیں بھولا تھا۔

وہ نادان تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ یہ سمجھ نہ پاتی کہ اسے تابو کے کمرے سے اغوا کر کے یہاں پہنچا دیا گیا ہے۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ بھاگ نکلنے کی کوئی راہ نہ ملی۔ مایوس ہو کر نہ کھایا جا سکنے والا کھانا کھانے لگی۔ رونے کی عادی نہیں تھی مگر جب باتھ روم کی حالتِ زار دیکھی تو رونے بیٹھ گئی۔ شام کو پربت شاہ کے آنے تک اس کی حالت خاصی دگرگوں ہو چکی تھی۔ وہ جب کمرے میں داخل ہوا تو اس کے عقب میں نوری کھڑا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں خوفناک شکل والی گن جبکہ بائیں ہاتھ میں ہلکے سبز رنگ کی فائل تھامی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔

سنبل نے چیخ چیخ کر اغوا ہونے پر احتجاج کیا۔ پربت شاہ جواباً طنزیہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے دروازے میں کھڑا اسے دیکھتا

رہا۔ جب سنبل کا گلا بیٹھ گیا، روہانسی ہو کر بیڈ پر گر گئی تو وہ قریب آ گیا۔ اس نے اس کے بال مٹھی میں بھرے اور بے دردی سے بیڈ سے نیچے کھینچ لیا۔ مارے تکلیف کے اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے۔ آنے والے وقت میں یہ طے ہوا کہ یہ تکلیف بہت معمولی تھی۔ پربت شاہ نے اسے اس ظالمانہ انداز میں پیٹا کہ وہ بلبلا اٹھی۔ اسے دھکا دے کر دیوار کی جڑ میں پھینک دینے کے بعد وہ کمرے کے وسط میں کھڑا ہو گیا۔ ہانپ رہا تھا، سانسیں برابر کرتے ہوئے بولا ''اب وہ سب بکواس کرو ناں جو حویلی میں کر رہی تھی......کتیا کی بچی......''

اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ گالی سن کر یکبارگی غرائی ''میں نہیں، تم کتے ہو...... بے غیرت ہو...... بے حس ہو۔ آئی ول شوٹ یو......''

وہ بھڑک کر بڑھا۔ پھر کسی خیال کے تحت رک گیا۔ پلٹ کر نوری کے پاس گیا۔ اس کے ہاتھ سے فائل لے کر بولا ''اسے بتاؤ کہ یہ کس کو گالیاں دے رہی ہے۔''

اس کا انداز بہت جارحانہ تھا۔ نوری نے قدم بڑھایا۔ سنبل کو دونوں ہاتھوں میں بچے کی طرح اٹھا کر دیوار میں دے مارا۔ اس کے حلق سے بلند چیخ نکلی۔ ساتھ میں اس نے انگریزی میں پربت شاہ کو دو چار گالیاں دیں۔ نوری نے اس پر تھپڑوں، لاتوں اور مکوں کی بارش کر دی۔ چند ہی لمحوں میں سنبل نے سپر ڈال دی۔ اس کا بے جان وجود دیوار کی جڑ میں متوازی پڑا تھا اور اس پر نوری کی ٹھوکروں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ نوری نے پربت شاہ کے حکم پر اس پر ٹھنڈا پانی ڈالا۔ وہ ہوش میں آ گئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے پربت شاہ کو دیکھنے لگی۔

وہ اپنی پاٹ دار آواز میں بولا ''لڑکی! سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تم میری بھتیجی نہیں ہو۔ تمہاری رگوں میں میرے باپ دادا کا خون نہیں، بلکہ ایک انگریز عورت کا خون ہے۔ اسے بہتا دیکھ کر مجھے ترس نہیں آئے گا۔''

پربت شاہ نے کچھ توقف کیا۔ وہ کچھ کہنے لگی تو ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ کہا ''دوسری بات یہ ہے کہ یہ دونوں وادیاں میری ہیں۔ ان میں کسی الو کے پٹھے کا ایک پتھر بھی موجود نہیں ہے، خواہ وہ نورنگ شاہ ہی کیوں نہ ہو......اور تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ تمہارا دنیا سے رابطہ کٹ چکا ہے۔''

اس نے رک کر شعلہ بار نظروں سے اسے سر تا پا گھورا۔ دہشت طاری کرنے والا لہجہ اختیار کیا۔ سلسلہ کلام جوڑا ''تم پردیسن ہو۔ تم پر ترس کر سکتا ہوں۔ تمہیں ولائت بھیج سکتا ہوں مگر اس کے لئے تمہیں دو میں سے ایک آپشن کا انتخاب کرنا ہو گا۔ پہلا آپشن یہ ہے کہ تم ان کاغذات پر دستخط کرو گی۔ میں تمہیں اندھیرے میں نہیں رکھتا۔ صاف بتاتا ہوں کہ ان پر دستخط کرنے کے بعد تمہارا اسندر بن سے

قانونی طور پر تعلق ختم ہو جائے گا۔دوسرا آپشن یہ ہے کہ تم میرے دونوں میں سے ایک بیٹے کے ساتھ شادی کروگی۔ان میں سے کوئی بھی آپشن قبول کرنے پر تمہیں زندہ سلامت یہاں سے نکال دیا جائے وگرنہ......''

اس نے ہونٹ کچکچائے۔اپنی آواز میں خوفناک تاثر پیدا کیا،''تمہیں علم ہوگا کہ تمہاری موت کے بعد یہ جائیداد میرے نام منتقل ہو جائے گی۔یعنی تمہیں......''

اس نے اپنی گردن کے برابر ہتھیلی لہرائی،''نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری......اب فیصلہ تمہارے اختیار میں ہے۔''

وہ ڈر گئی۔سہمے سہمے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔گھٹے گھٹے لہجے میں بولی،''انکل!تم نے مجھے انڈر اسٹیمیٹ کیا ہے۔میں یو کے سیٹیزن ہوں۔مجھے قتل کروگے تو بہت برے انجام سے دوچار ہو جاؤ گے۔میں نہ ہی سائن کروں گی اور نہ ہی تمہارے گندے خون والے بیٹوں سے شادی کروں گی۔''

اس کا لہجہ اٹل تھا۔چند لمحے کھڑا رہ کر گھورنے کے بعد پربت شاہ نے اسے سوچنے کا وقت دیا اور کمرہ چھوڑ دیا۔اس کی آواز سنبل کے کانوں پڑی،''نوری!تم بھی آنکھیں کھلی رکھنا۔یہ کتیا بھاگنے لگے تو گولی مار دینا۔میں نے اسے زندہ رہنے کی بہت تھوڑی سی مہلت دی ہے۔''

بھاگنے کی راہ مسدود پا کر اس نے دو نہایت تکلیف دہ دن رونے اور سوچنے میں گزارے۔اس کا سارا بدن دُکھتا تھا مگر کوئی مرہم نہیں تھا۔بخار ہوا مگر شام تک اتر گیا۔بدن میں شدید نقاہت چھوڑ گیا۔گن مین دو وقت کمرے کے اندر آتا تھا۔کھانے کی ٹرے رکھنے کے دوران چوبند رہتا۔وقتاً فوقتاً نوری بھی آن دھمکتا۔وہ اسے دہشت میں مبتلا کرنے کے لئے قتل کی دھمکیاں دیتا یا دو چار ہاتھ رسید کر دیتا۔سنبل نے ان چند دنوں کو اپنی زندگی کا بھیانک مرحلہ قرار دیا تھا۔

تیسرے دن،سہ پہر میں اس نے بڑی احتیاط سے چوبی میز کی ایک ٹانگ نکال لی۔شام میں جب گن مین کھانا دینے آیا،سنبل نے باتھ روم میں پانی ختم ہونے کا کہا۔وہ ٹرے رکھ کر باتھ روم میں گیا۔بالٹی اٹھا کر کمرے سے نکلا۔جاتے ہوئے دروازہ مقفل کرنا نہیں بھولا تھا۔جب پانی کی بالٹی اٹھائے واپس آیا اور باتھ روم میں جانے لگا تو سنبل کو اس کی غفلت کا مختصر سا وقت مل گیا۔اس نے دبے پاؤں اس کی پشت پر پہنچ کر دونوں ہاتھوں میں پکڑا ہوا میز کا پایہ اس کے سر میں دے مارا۔وہ کراہ کر پلٹا تو اس کے سر میں دوسری زوردار ضرب لگی۔پانی سے بھری ہوئی بالٹی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور پانی فرش پر بہہ گیا۔اس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھاما اور زمین پر بیٹھ گیا۔سنبل نے دانت کچکچا کر تیسرا اور فیصلہ کن وار کیا۔وہ ڈھیر ہو گیا تو سنبل نے باہر کا رخ کیا۔وہ ایک مختصر سا پہاڑی مکان تھا۔چھوٹا سا صحن تھا جو اس وقت بالکل خالی تھا۔کسی کو نہ پا کر بھاگتی ہوئی بیرونی دروازہ عبور کر گئی۔سامنے وادی کی خوبصورت سبز

ڈھلان تھی جس پر سردی اور کمزور اندھیرے کا راج تھا۔

جونہی اترائی میں پہنچی، سمتوں کا تعین بھول گئی۔ ادھر ادھر چکرانے لگی۔ حویلی کی بتیوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ اترتی شام اپنے جلو میں گہرا اندھیرا، ہڈیوں میں اترنے والی سردی اور بادلوں کو کھینچ لائی تھی۔ دوڑتے دوڑتے رک گئی۔ خیال آیا کہ ایسے دیوانوں کی طرح کب تک دوڑتی رہے گی۔ ایک جگہ بیٹھ کر سوچنے لگی کہ وہ اس خون آشام وادی سے کیسے نکل سکتی ہے؟ سمجھ میں نہ آیا کیونکہ اس نے اس علاقے کو اچھی طرح دیکھا بھالا نہیں تھا۔ ایسے میں حویلی میں ہلچل کا احساس ہوا۔ پھر ملبے پر گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس چمکیں۔ چند لوگ بھاگتے دوڑتے نظر آئے۔ سمجھ گئی کہ اس کا فرار مخفی نہیں رہا تھا اور اس کی تلاش کا کام زور و شور سے شروع ہو چکا تھا۔

پتھروں پر دوڑنے سے آہٹ پیدا ہوتی تھی۔ زمین پر گری پائن کی سوکھی ٹہنیاں بھی آواز پیدا کرتی تھیں۔ اس لیے وہ دبے پاؤں حویلی سے دور ہونے لگی۔ اس نے یہ ترجیح ذہن میں رکھی کہ زیادہ سے زیادہ جھاڑیوں میں چھپی رہ کر سفر جاری رکھے۔ اس کی یہ ترکیب کامیاب رہی۔ اسے تلاش کرنے والے کئی مرتبہ اس کے اتنے قریب پہنچے کہ اسے سانس روک کر خود کو چھپانا پڑا۔ موت کا خوف سردی کے احساس پر غالب رہا مگر سردی اپنا کام دکھاتی جا رہی تھی۔ اس کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ جب وہ حویلی کے مخالف سمت والی پہاڑی پر چڑھ رہی تھی تو اسے بار بار رکنا پڑ رہا تھا۔ متعدد بار اس کے ہاتھ شل ہوئے جنہیں زور زور سے رگڑ کر اس نے بحال کیا۔ برہنہ پائی کی وجہ سے پاؤں بالکل سن ہو چکے تھے۔

جب آس پاس، کہیں قریب، کہیں دور ٹارچ لائٹس کا ہالہ چکراتا دیکھتی تو وہ جہاں ہوتی، وہاں بلی کی طرح دبک جاتی۔ شاید رات نے آدھا سفر طے کر لیا تھا جب وہ گھنے جنگل میں سے گزر کر اس سڑک کے قریب پہنچی۔ اسے علم نہیں تھا کہ وہ اس ننھے سے درے کو عبور کر کے سڑک پر پہنچ جائے گی۔ وہ تو بس پہاڑی پر چڑھ کر اس وادی سے نکلنا چاہتی تھی۔ عام لباس میں تھی۔ اس پر مستزاد خوف کے شدید عالم میں تھی۔ جونہی اس نے برف کے مانند یخ پتھر پر دونوں ہاتھ رکھے اور اوپر اٹھنا چاہا، اس کا جسم یکبارگی زور سے کانپا۔ گرنے سے بمشکل بچی۔ یوں لگا جیسے پھیپھڑوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہو۔ پوری قوت سے سانسیں لینے لگی۔ ایسے میں اس کا ذہن سونے لگا۔ گہری نیند...... یا بے ہوشی...... اس کے پاس اس تفریق کی مہلت بھی ختم ہو گئی تھی۔ ابھی اس کا آتش کدہ بجھا نہیں تھا مگر اسے احمد کی شکل میں ایک بہترین اور ہمدرد معاون مل گیا تھا جو ایک طویل جدوجہد کے بعد اسے بارہ کہو کے اس ہوٹل تک پہنچانے میں کامیاب رہا تھا

❀❀❀

اس کی داستان تھم چکی تھی۔ اس نے سر گھما کر بیڈ پر نیم دراز احمد کو دیکھا جو بڑے انہماک سے سگرٹ کے کش لینے میں مشغول تھا۔ سنبل کو لگا کہ وہ اس کی کہانی سن ہی نہیں رہا تھا۔ بولی، ''احمد! کیا تم میری سٹوری میں انٹرسٹڈ نہیں ہو؟''

وہ چونکا۔ بولا، ''ایسی کوئی بات نہیں۔ تم جو کہہ چکی ہو، وہ سن چکا ہوں۔''

''تم نے مجھ سے کچھ پوچھا ہی نہیں۔'' اس کی آواز میں مایوسی کا رچاؤ تھا۔

وہ اسے دیکھے بغیر بولا، ''تم نان اسٹاپ بول رہی تھیں۔ روکنا اچھا نہیں لگا۔''

احمد کا ردعمل عجیب لگا۔ بولی، ''اِٹ از اوکے..... اب مجھے کیا کرنا چاہیے، یہ بتادو۔''

وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کے چہرے پر نظریں جما کر بولا، ''کیا تم اپنی جائیداد حاصل کرنا چاہتی ہو؟''

وہ سوچ کر بولی، ''میرے نزدیک پہلے بھی وہ اتنی قیمتی نہیں تھی جتنے وہ لوگ جو بے آسرا ہو گئے ہیں۔ میں سندربن کو دوبارہ ان لوگوں کے لئے آباد کرنا چاہتی تھی۔ مگر مجھ سے اب یہ بھی نہیں ہوگا۔ میں بس واپس جانا چاہتی ہوں۔''

احمد نے ایک دو ننھے ننھے کش لیے، سگرٹ کو کافی دیر تک ایش ٹرے میں مسلتا اور بغور دیکھتا رہا، پھر سر اٹھائے بغیر بولا، ''سنبل! یعنی تم نے پربت شاہ اور افروز شاہ سے ہار مان لی۔ ایسا ہی ہے ناں؟''

وہ کچھ نہ بولی۔

''اوکے! میں سمجھ گیا۔ تمہارا انسانی ہمدردی کا بھوت اتر گیا ہے۔ تم واپس جانا چاہتی ہو۔ ایک بات بتاؤ، کیا سنڈرلینڈ میں تم جیسی احمق لڑکیوں کو اتنی بڑی پوسٹ دے دی جاتی ہے؟''

وہ براہِ راست چوٹ پر تلملائی، ''کیا مطلب؟ میں نے کیا حماقت کی ہے؟''

''ہاں!'' وہ مسکرایا، ''ایک نہیں..... کئی حماقتیں سرزد ہوئی ہیں۔''

''میں نے کوئی غلطی نہیں کی احمد!'' وہ یقین سے بولی۔

''اچھا! تو پھر غور سے سنو! تم نے اتنے اہم مشن کیلئے ہوم ورک نہیں کیا۔ تم نے نجانے کیوں یہ طے کرلیا کہ تمہارے حویلی میں پہنچتے ہی سب معاملات اوکے ہو جائیں گے۔ تم نے پاکستان آنے کے بعد اپنے امور کو کسی وکیل سے ڈسکس نہیں کیا۔ ریونیو ڈیپارٹمنٹ سے رابطہ نہیں کیا۔ انگلینڈ کے سفارت خانے سے رجوع کرنا ضروری تھا، نہیں کیا۔ تم نے سندربن کے قریب جا کر اس کے بارے میں پن چھان نہیں کی۔ نہ سمیر سے رابطہ کیا اور نہ اپنے دفاع کے لئے کوئی قانونی آڑ لی۔ پولیس کو ٹچ نہیں کیا..... نہیں، میری جان! زندگی ایسے احمقانہ انداز میں کیسے گزاری جاسکتی ہے؟ میں تو شکر کرتا ہوں کہ تم بھیانک موت مرنے سے بچ گئی ہو۔''

احمد کی باتوں نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ کئی ثانیے خاموشی سے قالین کریدتی رہی، پھر شکست خوردہ انداز میں بولی، ''ہوں..... میں نے بہت بڑی غلطی کی کہ منہ اٹھائے سندربن پہنچ گئی۔ تم درست کہہ رہے ہو۔ میں احمق ہوں۔ جب میں اپنی حفاظت کے لئے کچھ نہیں

کرسکتی تو میں لوگوں کو کیسے خطرات سے بچا پاؤں گی۔ یقینی طور پر میں سنڈرلینڈ پہنچتے ہی پولیس ڈیپارٹمنٹ چھوڑ دوں گی۔''

''پلیز! انگلش نہیں...... اُردو بولو۔ اس سے مجھے اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔'' احمد کے لبوں پر شوخ مسکراہٹ رقصاں تھی۔

سنبل نے یہی بات اُردو میں دہرائی۔ وہ بولا، ''اگر تم اپنے اس ارادے کی تکمیل چاہتی ہو جو تمہیں پاکستان لایا، تو میں تمہاری مدد کروں گا۔ اگر تم شکست تسلیم کر کے بھاگنا چاہو گی تو بھی تمہارے ساتھ ہوں گا۔ اب میں چند سوال پوچھنا چاہوں گا۔ پہلا سوال یہ ہے کہ اغوا ہونے کے بعد جب پربت شاہ نے تمہارے سامنے دو آپشن رکھے تو تم نے پہلا آپشن قبول کیوں نہیں کیا؟ جائیداد، جس کی تمہارے نزدیک زیادہ اہمیت بھی نہیں، چھوڑ کیوں نہیں دی؟''

وہ بولی، ''سندر بن میرے آنجہانی بابا کی وادی ہے۔ میں اسے مکروہ دھندوں کے لیے استعمال ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔''

''او کے! آئی ایگریڈ وِدیو...... باوجود کہ اب تم اسی پربت شاہ کی تحویل میں چھوڑ کر وطن واپس جارہی ہو۔ نیکسٹ آپشن۔ تم اپنے خونی رشتہ داروں کے لئے محبت کا پیام بن کر یہاں آئی۔ تم نے یہی ظاہر کیا۔ ٹھیک؟ اب یہ بتاؤ کہ تم نے پربت شاہ کی بہو بننا قبول کیوں نہیں کیا؟''

احمد کی تیز، چبھتی ہوئی نظریں اس پر مرکوز تھیں۔ وہ گڑبڑائی۔ احتیاط لازم تھی۔ سوکچھ دیر سوچ کر بولی، ''مجھے پربت شاہ اور اس کی رگوں میں دوڑنے والے خون سے ہی نفرت ہوگئی تھی۔ مجھے اس خیال سے بھی گھن آتی ہے تو میں اس کے کسی بیٹے سے شادی کروں۔''

وہ بدستور اسے دیکھتا رہا، بولا ''ہر انسان اپنے عمل کا جواب دہ ہے۔ تم نورنگ شاہ کی بیٹی ہو۔ تمہاری رگوں میں وہی خون دوڑتا ہے جو پربت شاہ اور اس کی اولاد میں...... پھر تمہیں اپنے آپ سے نفرت کیوں نہیں ہوئی؟''

اس کے بھرے بھرے لبوں سے سیٹی برآمد ہوئی۔ توقف کے بعد بولی، ''اوہ کم آن احمد! یہ تم کیا ٹاپک لے بیٹھے ہو۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس حویلی کے تمام مردوں کے چہرے بھیانک اور کریہہ ہیں۔ میں کیسے اس گھر میں شادی کرسکتی ہوں۔ افروز بدکردار اور ان پڑھ ہے۔ شادی شدہ ہونے کے باوجود ہوسیلا ہے۔ اس کی فطرت میں رچی ہوئی درندگی میں دیکھ چکی ہوں۔ دوسرے کو میں نے دیکھا تک نہیں۔ البتہ آنٹی نے بتایا تھا کہ ظفر شاہ منشیات کا عادی ہے۔ کئی مرتبہ علاج کے بعد بھی ٹھیک نہیں ہوا۔ نہیں احمد! تم سندر بن کے رہنے والے ہو۔ یقیناً تمہارا گھر بھی مسمار ہوگیا ہے۔ تم مجھ سے کہیں بہتر طور پر پربت شاہ اور اس کے خاندان کو جانتے ہو۔''

''ہاں! میں سبھی کو جانتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ پربت شاہ تمہاری شادی اپنے تیسرے بیٹے سے کرنا چاہتا ہو۔ اس کا نام جمال شاہ ہے۔ وہ ان پڑھ نہیں اور نہ ہی نشہ کرتا ہے۔ یونیورسٹی لیول میں ہے۔'' احمد نے کہا، ''تم نے اسے دیکھے بغیر کیسے رد کردیا؟''

اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ احمد نے ٹھیک کہا تھا، بولی، ''اوں...... تم ٹھیک انداز میں سوچتے ہو۔ مگر احمد! وہ بھی تو پربت شاہ کا بیٹا

ہی ہے۔اسی کا خون ہے۔اس کے زیرِ تربیت پلا بڑھا ہے۔میں اس پر کیسے اعتبار کر سکتی ہوں؟ یقیناوہ ان سے بھی دو چار قدم آگے ہو گا۔نو احمد نو! آئی ہیٹ ہم...... آئی ہیٹ آل...... مجھے ان کے کردار سے گھن آتی ہے۔''

اس کا لہجہ حتمی تھا۔احمد نے کہا،''اوکے......تم نے یقیناً سمیرا اور اس کے خاندان کو اس لیے اس معاملے میں نہیں ڈالا کہ تمہارے نزدیک وہ بہت کمزور لوگ ہیں۔تمہارے جانے کے بعد کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو سکتے ہیں۔''احمد اس سے پوچھ نہیں رہا تھا بلکہ اپنا قیاس آشکار کر رہا تھا۔اس نے اثبات میں سر ہلایا۔احمد نے اپنی گفتگو جاری رکھی،''لیکن تم نے موت کے ڈر سے انسانی ہمدردی کے جذبے کو بھی سلا دیا، یہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔''

''احمد پلیز! میں واپس جانا چاہتی ہوں اور بس...... مجھے مت اکساؤ۔یہ سارا ملک گندا ہے۔یہاں کے رہنے والے گندے ہیں۔میں یہاں نہیں رہ سکتی۔''اس کے آواز میں زہر ہی زہر بھرا ہوا تھا۔

احمد بیڈ سے اترا۔اس پر ترحم آمیز نگاہ ڈال کر کمرے کی عقبی کھڑکی کی جانب بڑھا۔طاق کھولے۔ٹھنڈی ہوا کا جھونکا چہرے سے ٹکرایا۔آنکھیں بند کر کے لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ایسے میں سنبل اس کے عقب میں آ گئی۔اس کی بغلوں سے ہاتھ نکال کر کمر سے چپک گئی۔اس کا لباس گندا تھا مگر سنبل کو احساس نہیں تھا۔اس کے سینے پر دونوں پھیلے ہوئے ہاتھ پھرتے ہوئے بولی،''احمد! ویری سوری...... میں جوش میں غلط کہہ گئی۔یہ تمہارا ملک ہے۔گندا نہیں ہے۔کچھ لوگ گندے ہیں۔تم بہت اچھے ہو۔میں ہرگز اچھی نہیں ہوں۔تمہارے مقابلے میں اچھا نہیں بول پائی، مجھے معاف کر دو۔مگر میں یہاں سے جلد از جلد جانا چاہتی ہوں۔میری مدد کرو۔میں تمہاری مدد کو کبھی بھی بھول نہیں پاؤں گی۔''

احمد نے روح کو گدگداتے ہاتھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے، بولا،''ڈونٹ وری سنبل! میں تمہاری مدد کا ارادہ رکھتا ہوں۔میں دل کی بات کرتا ہوں کہ تم سندر بن کو اپنی تحویل میں لے کر سٹزرلینڈ جاؤ۔''

''یہ ممکن نہیں ہے ناں!''سنبل نے آہستگی سے کہا اور اس کے کندھے پر اپنا گال رکھ دیا۔سکون ملا۔ہولے ہولے رگڑنے لگی۔یوں لگا جیسے زندگی میں مرد کا پہلا جاگتا ہوا لمس ملا تھا جس نے روح تک میں سرشاری بھر دی تھی۔بولی،''وہ لوگ بے حس ہیں۔انہیں رشتوں کی قدر کا علم نہیں۔وہ صرف پتھروں کے طلبگار ہیں۔میں انہیں پتھر دے آئی ہوں۔اپنی زندگی بچا لائی ہوں۔کیا یہی کافی نہیں ہے؟......اور احمد! وہ مجھے قتل کر دیں گے مگر مجھے سندر بن نہیں دیں گے۔میں چٹان کے نیچے پڑے ہوؤں کے لئے زندگی بھر کڑھتی رہوں گی مگر کچھ کر نہیں پاؤں گی۔میرے پاس اتنی بھی دولت نہیں ہے کہ میں انہیں کہیں اور بستی آباد کر دوں۔''

احمد بڑی آہستگی سے پلٹا۔یوں کہ اس کی بانہوں کی سلطنت کے اندر رہا۔اس کا گلابیں چہرہ ہاتھوں میں لے کر کئی ثانیے تک اسے

دیکھتا رہا پھر بولا، ''سنبل! تم سندر بن لے سکتی ہو۔ اس کے لیے تمہیں اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ بس تھرو پراپر چینل چلنا ہوگا۔ تم برٹش ہائی کمیشن میں جاؤ گی۔ اپنا تعارف کراؤ گی۔ ہائی کمشنر سے اپنے پولیس چیف کی فون پر بات کراؤ گی۔ وہ تمہارے معاملے کو بہت بہتر انداز میں ہینڈل کریں گے۔ چونکہ تمہارے ٹریولنگ پیپرز اور سامان سندر بن میں پڑا ہے۔ اسے لانا ضروری ہے۔ پولیس کی مدد سے ہائی کمشنر بہ آسانی وہ سامان اٹھالے گا۔ اسی طرح وہ تمہاری پراپرٹی کیس پر بھی کام کرے گا۔ تم کسی بڑی فرم کے ساتھ لینڈ لیز ایگریمنٹ سائن کروگی۔ سفارت خانہ ریونیو ڈیپارٹمنٹ کی مدد سے وہ ساری زمین پربت شاہ سے واگزار کرا کر فرم کی تحویل میں دے دے گا۔ تمہیں سامنے آنے کی ضرورت بھی نہیں رہے گی......بس! کیا تم اتنا سا کام بھی نہیں کرسکوگی؟''

احمد نے ہتھیلی پر سرسوں جما کر دکھادی تھی۔ سنبل کی آنکھوں میں حیرت بھر گئی۔ گالوں پر سرکتا ہوا ایک ہاتھ تھام کر لبوں سے لگایا، بولی، ''ریئلی؟''

اس کی بڑی بڑی آنکھوں کے استعجاب نے پوچھا، 'اے دلیر انسان! کیا یہ اتنا ہی آسان کام ہے؟'

احمد مسکرایا۔ اسے بڑی آہستگی سے سینے سے لگا کر آنکھوں سے بولا، 'اے خوب صورت لڑکی! میں تمہارے ساتھ ہوں ناں!''

سنبل نے اپنا سر اس کے سینے پر ٹکا دیا۔ لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ ایسے میں نیند بھی آنے لگی۔ آہستگی سے علیحدہ ہو کر انگریزی میں بولی، ''مجھے سونے کی تھوڑی سی مہلت دے دو۔ میں شاید اپنے آپ سے الگ ہو رہی ہوں۔''

احمد اسے قدم قدم چلاتا ہوا بیڈ پر لایا۔ اسے رسان سے لٹا کر پہلو میں بیٹھ گیا۔ پیار بھرے انداز میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ کہنے لگا، ''تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ سوجاؤ۔ جاگنے پر بہتر فیصلہ کر پاؤ گی۔ گو اہیڈ فار آ پنک ڈریم......''

احمد کا داہناں ہاتھ بالوں سے نکل کر گداز گالوں، لبوں اور گردن کی وادیوں میں آوارگی کرتا رہا اور وہ پر تحفظ لمس کے تابع گہری نیند میں چلی گئی۔ چند منٹوں میں ہی اس کا جسم بیڈ پر منتشر ہوگیا جبکہ احمد نے بیڈ چھوڑ دیا، سنبل پر کمبل ڈالا، کھڑکی بند کی اور ہوٹل کی ریسیپشن پر جانے کیلئے کمرے سے نکل آیا۔ اسے ابھی چند کام کرنا تھے۔ ریسیپشن پر چائے کا آرڈر نوٹ کروا کر ہوٹل کی لابی میں آ بیٹھا۔ وہ سیپرٹ ٹی کا عادی نہیں تھا مگر اس درمیانے درجے کے ہوٹل میں یہی چائے ملتی تھی۔ اس کے ایما پر نیلی یونیفارم میں ملبوس ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکا سڑک کے کسی چھپر ہوٹل سے چائے لینے کے لئے روانہ ہوگیا تھا۔

اس کی پیشانی پر فکر و تردد کی غماز لکیروں کا جال سا تنا ہوا تھا۔ وہ گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ آئندہ کا لائحہ عمل تیار کر رہا تھا۔ نجانے کیوں اس کا دل اس لڑکی کی بھرپور مدد پر مائل تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے آج نہیں تو کل سنڈر لینڈ روانہ ہو جانا تھا۔ پربت شاہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے، اسے کوئی تعرض نہیں ہونا چاہیے تھا مگر وہ خود کو آگے بڑھنے سے روک نہیں پا رہا تھا۔ ایسا زندگی میں کم کم ہوتا

ہے۔ پرائی آگ کو اپنے ہاتھوں پر لپیٹنا اور سینے سے لگالینا بہت مشکل ہوتا ہے مگر وہ اسے آسان کرنے پر تلا ہوا تھا۔

چائے پینے کے دوران اس نے اپنا پرس نکالا۔ نوٹ گنے۔ دل ہی دل میں حساب کتاب کیا۔ مطمئن ہو گیا۔ بڑبڑایا، ''نہیں یار! تم نے ہمیشہ ناکارہ زندگی گزاری ہے۔ اب زندگی کو ڈھنگ کا ایک کام مل ہی گیا ہے تو بزدل کیوں بنتے ہو...... زندگی کی قیمت چکانے کیلئے دنیا کے کسی ایک شخص کے کام تو آہی جاؤ ناں......''

اپنے جملے پر جواباً مسکرایا۔ واپس کمرے میں آیا۔ سنبل بے دھڑک سو رہی تھی۔ وہ اس کے قریب کھڑا بغور دیکھتا رہا۔ وہ بلاشبہ حسن کا مکمل شاہکار تھی۔ توازن کی جیتی جاگتی مثال تھی۔ ہاتھ، پاؤں، چہرہ، گردن...... اور سب کچھ...... قدرت نے ہر لحاظ سے فراخی برتی تھی۔ وہ کافی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس پر کمبل درست کر قالین پر پہلو میں بیٹھ گیا۔ خوابیدگی نے کروٹ بدلی۔ ایک ہاتھ رخسار کے نیچے جبکہ دوسرا بیڈ کے باہر لٹک گیا۔ احمد نے نرمی سے اس کا اس کا ہاتھ تھاما، لبوں سے لگایا پھر لبوں اور آنکھوں پر رگڑنے لگا۔ اس نے پہلی چوری کی تھی۔ ایسے میں بے ساختہ لبوں سے نکلا، ''نہیں یار! تم اچھے نہیں ہو۔ تم بھی ہزاروں لاکھوں مردوں کی طرح ہو جو موقع نہ ملنے پر سادھو ہوتے ہیں جبکہ موقع ملنے پر گدھ بن جاتے ہیں۔''

اس کا ضمیر بول رہا تھا۔ دل مسکرا رہا تھا۔ اپنی سیرابی میں مگن تھا۔ وہ سیکڑوں میں شامل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ لاکھوں ہزاروں کی ایوریج لسٹ میں اپنا نام لکھوانا چاہتا تھا۔ اسے خبر تھی کہ سنبل بہت تھکی ہوئی تھی۔ کافی دیر بھوک پیاس میں گزارنے کے بعد پیٹ بھر کر کھا چکی تھی۔ جلد جاگنے والی نہیں تھی مگر ضمیر نے ہاتھ سے بس کلائی تک جانے کی مہلت دی، پھر مسلسل کچوکے دے کر اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اٹھ کر ایک مرتبہ پھر ہوٹل سے نکل آیا۔ بازار میں گھوم پھر کر اپنے لیے لباس اور جوتے خریدنے میں محو ہو گیا۔ ریسٹ ہاؤس سے ملنے والا لباس سنبل پر فٹ نہیں تھا۔ اس نے اندازے کے مطابق اس کے لئے بھی ایک سادہ مگر گرم سوٹ خریدا۔ ریسٹ ہاؤس سے ملنے والے جوتوں کے تلوؤں کی لمبائی ایک بالشت سے انچ بھر کم تھی۔ وہ اسے پورے تھے۔ اسی سائز کا ایک جوڑا خرید لیا۔ یہ مقامی ڈیزائن میں تھا اور زیادہ مہنگا بھی نہیں تھا۔ کچھ اس کے لئے، کچھ اپنے لیے ضروری سامان خرید کر کمرے میں آ گیا۔ وہ بدستور سو رہی تھی۔ اس کے ضمیر اور دل کی جنگ پر آمادہ تھی۔ اس نے نگاہیں چرائیں اور باتھ روم میں وضو کرنے گھس گیا۔ چند لمحوں بعد وارڈ روب سے جائے نماز نکال کر خدا کے دربار میں حاضر ہو گیا۔

عصر ہو چکی تھی۔ مغرب ہونے کو تھی۔ اس نے پہلے عصر، پھر کئی نوافل اور کانوں میں اذان کی آواز پڑنے پر مغرب کی نماز ادا کی۔ دل میں اطمینان کی طاقت ور لہریں موجزن ہو گئیں۔ ایک اچٹتی ہوئی نگاہ سنبل پر ڈالی۔ دل کو اس کی الگ صورت نے پہلے کی طرح گدگدایا نہیں تو مطمئن ہو کر جائے نماز چھوڑی اور صوفے پر آ گیا۔ سگرٹ سلگا کر، سپرنگ دار انرجی سیور کو گھورتے ہوئے بولا ''یار احمد!

کیا یہ پہلی لڑکی ہے جسے تمہاری آنکھ نے دیکھا؟...... یا آخری حسن کو دیکھ رہے ہو جس کے بعد زندگی میں کسی کے آنے کی توقع نہیں ہے؟...... یا تم اتنے ہی فضول واقع ہوئے ہو کہ اپنی زندگی کی تمام تر مصروفیات ترک کر کے اس کے خدائی مددگار بنے پھرتے ہو؟......''

جواب میں اپنے اندر بسیط خاموشی کا راج دیکھ کر ڈر گیا۔ دل کبھی چپ نہیں رہا تھا۔ تڑخ کر جواب دیتا تھا۔ کیا اس نے سنبل کو دیکھنے کے بعد احمد کے سوالوں کو اہمیت دینا ہی چھوڑ دیا تھا؟...... بولا ''ہوں! سمجھ گیا ہوں۔ تم پٹڑی سے اتر گئے ہو۔ فکر نہ کرو۔ تمہیں راہِ راست پر لانے کا ہنر رکھتا ہوں۔''

اس نے سر جھٹکا۔ ذہن پر اور تفکرات لادے اور سگریٹ پینے میں منہمک ہو گیا۔

وہ دس بجے بیدار ہوئی۔ کسلمندی چھٹی، احمد کو نماز میں مستغرق دیکھا پھر اسے پورے انہماک سے دیکھتی گئی۔ وہ دوزانو بیٹھا تھا۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ آنکھیں جائے نماز پر ٹکی ہوئی تھیں۔ چہرے کی معصومیت کے تقاضے کچھ اور نظر آئے۔ اختیار نہ رہا تو باتھ روم میں گھس گئی۔ تین چار منٹ بعد اس کے پہلو میں کھڑی تھی۔ آج اس نے غیر ارادی طور پر اس دربار سے رجوع کیا تھا جس دربار سے سب کچھ ملتا ہے۔

روم سروس سے کھانا کمرے میں ہی منگوا کر کھا لیا تو احمد نے ویٹر کو سنبل کے لیے کوارٹر سیٹ ٹی اور اپنے لیے چھپر ہوٹل کی چائے لانے کیلئے بھیج دیا۔ سنبل نے اچھی نیند لے لی تھی۔ احمد نہیں سویا تھا۔ اب سر بوجھل ہو رہا تھا۔ سنبل کے سوالوں کا 'ہوں، ہاں' میں جواب دے کر اپنی عدم دلچسپی ظاہر کر رہا تھا۔ وہ ہائی کمیشن کے ممکنہ تعاون کے بارے متفکر تھی۔ احمد شاید زیادہ علم نہیں رکھتا تھا، شاید زیادہ بولنا بھی نہیں چاہتا تھا، وہ گومگو کی کیفیت میں رہ کر بھی سمجھ گئی۔ بولی، ''تم میرے ساتھ ہی سو جاتے تو اچھا تھا۔''

اس دوران چائے آ گئی۔ سنبل اپنے لئے چائے بنانے لگی جبکہ اس نے ٹوٹی کناری والا کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔ بولا، ''میں نے ہوم ورک مکمل کر لیا ہے۔ ابھی رات ہے۔ جی بھر کر سوؤں گا۔ صبح اٹھ کر تمہیں تفصیل سے آگاہ کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ تم مجھ پر اعتبار کرو گی۔''

وہ چونکی۔ ایسے انسان پر، جس نے اسے زندگی لوٹائی ہو، کیوں کر بے اعتباری کی جا سکتی تھی؟

❀❀❀

علی الصباح سنبل اس سے پہلے تیار ہو چکی تھی۔ آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ اپنے سراپے کا جائزہ لینے کے بعد احمد کی خریداری کی دل ہی دل میں داد دے رہی تھی۔ احمد بھی بھرپور نیند لینے کے بعد انگڑائیاں لے رہا تھا۔ اپنا لباس اٹھا کر باتھ روم جانے لگا تھا جب سنبل نے اسے آئینے میں اپنے پیچھے دیکھ کر کہا، ''احمد! تمہاری تمام تر خریداری ٹھیک ہے۔ تم نے اتنے درست اندازے کیسے لگا

لیے؟''

اس نے جماہی لی۔ اپنے سامنے اس کے ریشمی لہراتے بالوں والی کمر اور آئینے میں چہرہ دیکھ کر بولا، ''میری ایک دوست تھی، ظفرین، میرے ساتھ کام کرتی تھی۔ ہم اکثر ساحل پر نکل جایا کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھار میری قریب آجایا کرتی تھی۔ ایسے میں اس کا قد بھی تمہاری طرح میری تھوڑی تک پہنچتا تھا۔ اس کا وزن بھی تمہارے جتنا تھا۔ پچپن کلوگرام۔ اور ہم خریداری کے لئے بھی اکٹھے نکلا کرتے تھے۔ بس...... تمہارے لیے سامان خریدتے ہوئے وہی معلومات کام آ گئیں۔''

وہ چونکی۔ بولی، ''یو مین گرل فرینڈ؟...... ہُم...... کیا اب بھی تمہاری اس سے دوستی ہے؟''

وہ بولا، ''دوستی رہتی ہے، دوست ساتھ رہے یا نہ رہے۔ اسے ایک اچھا موقع ملا۔ دبئ چلی گئی۔ آخری مرتبہ، کوئی ایک سال پہلے، اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ گارمنٹ فیکٹری میں اسسٹنٹ منیجر بن گئی تھی۔ اچھا کمانے لگی تھی۔ پھر رابطہ نہیں ہوا۔''

''یعنی اس نے نیا فرینڈ بنا لیا، تم نے کوئی اور...... ہے ناں؟'' سنبل نے بال سنوارتے ہوئے دلچسپی لی۔

''اس کے بارے کچھ نہیں جانتا۔ اپنے بارے جانتا ہوں۔ کسی نے قریب آنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید میں بھی اکتا گیا ہوں۔''

''یعنی تم نے بہت سی گرل فرینڈز بنائیں؟''

''نہیں تو...... بس ایک وہی تو تھی جو دوست بنی تھی۔''

''تو پھر اُکتا کیسے گئے؟ میں سمجھتی ہوں کہ اُکتا جانے کا عمل کسی مسلسل عمل کے نتیجے میں انجام پذیر ہوتا ہے۔'' وہ بولتے بولتے پلٹی۔

احمد مسکرایا۔ بولا، ''احمق ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی ہو۔'' آدھا جملہ اس نے باتھ روم میں گھس کر ادا کیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ تیار ہو کر باتھ روم سے نکلا تو وہ نماز پڑھ رہی تھی۔ اس نے جائے نماز چھوڑی تو احمد کھڑا ہو گیا۔ وہ اس کے پہلو میں بیڈ پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگی۔ شاید اس کے اندر کی دنیا بدلی تھی، یا احمد دم بہ دم بدل کر بہت ہینڈسم ہو گیا تھا۔ یا شاید اُجلے لباس کا کمال تھا۔ کچھ تھا جو دل پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ احمد نے نماز سے فارغ ہو کر انٹرکام پر روم سروس کو ناشتے کا آرڈر دیا۔ صوفے پر بیٹھ کر سگرٹ سلگائی۔ وہ بولی، ''جاگتے ہی سگرٹ پینے لگے ہو۔ یہ غلط ہے۔ اپنی صحت کا خیال رکھا کرو۔''

اس نے مسکرا کر ٹال دیا۔ اَدھ کھلی آنکھوں اسے دیکھا۔ بہت مقدس اور نایاب لگی۔ کھلے کھلے رنگ سے سوٹ بہت میچ کر رہا تھا۔ بولا، ''گھنٹہ بھر بعد ہم سفارت خانے کے لئے نکلیں گے۔ کیا تم نے سندر بن کو حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ بولی، ''نہیں احمد! میں بس واپس جانا چاہتی ہوں۔ پلیز! مجھے مجبور نہ کرو۔ جانے دو۔ آئی ڈونٹ کیئر اباؤٹ

سندر بن ناؤ......''

احمد کے چہرے پر مایوسی کا رنگ لہرایا مگر ثانیہ بھر میں معدوم ہو گیا۔ بولا ''اوکے! میں مصر نہیں ہوتا۔ مگر تمہیں اپنے کاغذات کیلئے ایک مرتبہ سندر بن جانا پڑے گا۔''

اس کی آنکھوں میں تشویش اور خوف جاگزیں ہوا۔ ٹھہر کر بولی ''ہاں! یہ تو ہے۔ مگر تم میرے ساتھ ہو گے ناں!''

اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔ بولا ''میں تمہارے ساتھ سندر بن نہیں جاؤں گا کیونکہ وہ میرا علاقہ ہے۔ وہ لوگ مجھے دیکھتے ہی میرے دشمن ہو جائیں گے۔ تمہارے جانے کے بعد مجھے بھی ہمیشہ کے لئے سندر بن چھوڑنا پڑے گا۔ امید ہے تم میری مجبوری سمجھ رہی ہو؟''

وہ سمجھ گئی۔ ڈر بھی گئی۔ احمد کے بغیر سندر بن نہیں جا سکتی تھی۔ جانا بھی ضروری تھی۔ کندھے اچکا کر بولی ''اوکے! ابھی ہائی کمیشن چلتے ہیں۔ پھر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ اگر مجھے سندر بن جانا پڑا تو میں پربت شاہ سے اپنی وادی چھیننے کی کوشش بھی ضرور کروں گی۔''

احمد کی آنکھوں میں جاندار چمک پیدا ہوئی۔ ایسے میں ناشتہ سرو کر دیا گیا۔ نو بجے، جب وہ کمرہ چھوڑنے لگے تو احمد نے اسے سوفے کے پاس روک لیا۔ سنبل کے کندھے پر مظلر کی طرح رکھی ہوئی نئی شال کو دونوں ہاتھوں میں پھیلایا۔ آنکھوں سے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ سمجھی مگر تھوڑا غلط سمجھی۔ قریب آکر رکنے کے بجائے احمد کی کھلی بانہوں کے نیچے سے ہاتھ نکال کر لپٹ گئی۔ وہ خود کو سنبھال نہ پایا۔ کمر کے بل دیوار سے ٹکرایا، بولا ''اوئے اوئے! یہ کیا کر رہی ہو؟''

وہ شرارت سے بولی ''تم نے خود ہی تو مجھے بلایا تھا۔''

اس نے بلایا نہیں تھا مگر بن بلائے مہمان کو خود سے علیحدہ کرنا بھی مشکل ثابت ہوا۔ سانسوں کے مد و جزر سے پہلو تہی کرتے ہوئے اس نے شال اوڑھا دی۔ کہا ''پلیز! ون سٹیپ بیک وارڈ!''

وہ الگ ہو کر تھوڑا پیچھے ہٹی۔ اس نے شال کا ایک پلو گھمایا، چہرہ چھپا کر دوسرے رخ پر ڈال دیا، بولا ''ایک ہاتھ سے شال کو پکڑ لو۔ نہیں...... ادھر سے نہیں...... اِدھر سے پکڑو......''

وہ شال میں چھپ گئی۔ یورپین لڑکی کا روپ اوجھل ہو گیا۔ مقامی دکھائی دینے لگی۔ احمد نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا، بڑبڑایا، ''اب ہمیں سفر میں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔''

ہوٹل سے چیک آؤٹ لینے کے بعد احمد اسے لیے مین روڈ پر آ گیا۔ موڑ پر ایک گیس پمپ پر قطار میں ٹیکسیاں نظر آئیں۔ چند ایک کالی پیلی گاڑیاں تھیں۔ چند ایک سفید رنگ کی بڑی کاریں تھی۔ اس نے ایک سیاہ شیشوں والی کار کا انتخاب کیا۔ اس سے کرایہ طے کیا اور

سنبل کو لیے پچھلی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ چند لمحوں بعد گاڑی کھلی سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔ ایمبیسی پہنچ کر احمد کے کہنے پر سنبل نے نقاب اتار دی۔

دونوں کے پاس شناختی دستاویزات نہیں تھیں۔ اس لیے غیر متوقع اور کئی اعصاب شکن مراحل سے گزر کر وہ اسسٹنٹ فارن کمشنر کے آفس میں داخل ہوئے۔ اندازاً پچاس سالہ چاق چوبند گورے نے میز کے پیچھے بیٹھے رہ کر ان کا استقبال کیا۔ سنبل نے گھٹنے موڑ کر سلیوٹ کیا، کہا، ''اسسٹنٹ سارجنٹ سنبل شاہ......فرام سنڈرلینڈ پولیس۔''

وہ چونکا۔ سوفے کی طرف اشارہ کر کے انگریزی میں مخاطب ہوا، ''بیٹھو۔ مجھے تمہارے آنے کی خوشی ہوئی۔ بتاؤ، میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔''

سنبل نے اپنا مکمل تعارف کرایا، پاکستان آنے کی غرض و غایت بیان کی اور پیش آنے والے واقعات اس کے سامنے رکھ دیے۔ ساتھ ہی اس نے احمد کا مختصر تعارف بھی کرایا۔ احمد نے بارہ کہو کے ہوٹل کا کمرہ چھوڑنے سے پہلے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ وادی سے فرار کے دوران قتل ہونے والوں کا بالکل تذکرہ نہیں کرے گی۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ جب تک سنبل بولتی رہی، میزبان آفیسر یکسوئی سے سنتا رہا، اپنے رائٹنگ پیڈ پر نوٹس لکھتا رہا۔ اس کے خاموش ہونے پر بولا، ''مس سنبل شاہ! ابھی تمہاری شناخت کی تصدیق باقی ہے۔ کیا تمہارے پاس سفری کاغذات ہیں؟''

اس نے کہا، ''نو سر! میں اپنے بیان کے دوران آپ کو بتا چکی ہوں کہ میرا سامان سندربن کی حویلی کے اندر ہے۔ میں جان بچا کر بھاگی ہوں۔ اگر میں کاغذات کے چکر میں پڑتی تو ماری جاتی۔''

اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا، ''پھر بھی میں تمہیں اپنی شناختی تصدیق کے لیے کہوں گا۔''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ خالی ہاتھ تھی۔ ایسے میں احمد نے اسے مخاطب کیا۔ اُردو میں کہا، ''تم نے بتایا تھا کہ تم فیس بک استعمال کرتی ہو جس کے ذریعے سمیر سے تمہارا رابطہ ہوا تھا۔ یعنی تم انٹرنیٹ یوزر ہو۔ تمہارا فیس بک کے علاوہ ای میلنگ آئی ڈی بھی ہوگا۔ ہو سکتا ہے تم نے کسی بھی ضرورت کے تحت اپنے ڈاکومنٹس کسی ادارے کو بھیجے ہوں۔ ایسی صورت میں 'سینٹ میل' باکس سے تم وہ پیپرز حاصل کر سکتی ہو۔''

سنبل نے اسے تحسین آمیز نظروں دیکھا۔ خوشی سے بولی، ''یس سر! آئی ہیو ایوری تھنگ ان مائی میل باکس...... یاد ہی نہیں رہا تھا۔ میں نے سنڈرلینڈ چھوڑنے سے قبل اپنے تمام کاغذات اسکین کر کے اپنے میل باکس میں رکھے تھے۔ تھینک یو احمد! تم نے میری بہت بڑی مشکل آسان کر دی ہے۔''

آفیسر نے مسکرا کر ایک بٹن پش کیا۔ اپنے ماتحت کو بلایا۔ اسے سنبل کو کمپیوٹر اور نیٹ کی سہولت فراہم کرنے کا حکم دے کر سنبل کو اس کے ساتھ بھیج دیا۔ احمد صوفے پر بیٹھا رہا۔ سنبل آدھے گھنٹے بعد لوٹی۔ تب تک کمرے میں خاموشی حائل رہی۔ آفیسر بڑے انہماک سے فائلوں میں مستغرق رہا۔ سنبل نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی فائل مودبانہ انداز میں میز پر رکھ دی۔ آفیسر نے اپنا کام نمٹا کر اس کی فائل کا معائنہ کیا۔ مطمئن ہو کر بولا، ''مس سنبل شاہ! تمہارے پیپرز مکمل ہیں مگر اوریجنل کاپیز نہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم سنڈر لینڈ نہیں جا سکتی ہو۔ اگر تم اپنے سامان کا نقصان برداشت کر لو اور اپنی زندگی کو خطرے میں نہ ڈالو تو تمہیں سندر بن جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس فائل کو اپنے پازیٹو کمنٹس کے ساتھ ہز ایکسی لینسی ہائی کمشنر کو ریفر کر دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری واپسی کا موزوں بندوبست کر دیں گے۔''

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں کا ردعمل مختلف تھا۔ سنبل خوش تھی جبکہ احمد پر مایوسی نے حملہ کر رکھا تھا۔ وہ بولی، ''تو مجھے اب کیا کرنا ہو گا؟''

''تم ایک گریٹ کنٹری کی معزز شہری ہو۔ پاکستان میں تمہاری حفاظت اور مدد کرنا اس دفتر کی ذمہ داری ہے۔ تمہارے کاغذات کی متعلقہ محکموں سے جانچ پڑتال، ریٹرن ٹکٹ پر سیٹ ریزرویشن اور باقی معاملات کے لئے ہمیں دو دن درکار ہیں۔''

''یعنی میں تھرس ڈے کو دوبارہ یہاں آؤں؟''

''نہیں...... میں سمجھ رہا ہوں کہ تمہاری جان خطرے میں ہے۔ تمہارے ساتھ کوئی بھی غیر متوقع صورتِ حال پیش آ سکتی ہے۔ ہائی کمیشن تمہاری رہائش اور حفاظت کا بندوبست کرے گا۔'' اس نے ایک کاغذ اور بال پوائنٹ میز پر اس کی طرف سرکائی، ''تم مجھے انہی سہولیات کے مطالبے پر مبنی درخواست لکھ کر دو۔ میں اسے بھی متعلقہ شعبے کو ریفر کر دیتا ہوں۔ میرا آفس بہترین کوشش کرے گا کہ تمہیں پاکستان میں کسی دقت کا سامنا نہ ہو۔''

اس نے احمد کی مدد سے درخواست لکھی۔ آفیسر کے حوالے کی۔ اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اسے تھمایا۔ کہا، ''تم جہاں جانا چاہو، چلی جاؤ۔ تمہارے پیپرز کی تصدیق ایک گھنٹہ میں ہو جائے گی۔ تم دو سے تین گھنٹوں بعد فون پر مجھ سے رابطہ کرو گی تو میں تمہیں گائیڈ کروں گا۔''

سنبل نے کارڈ احمد کو دیا اور سیلوٹ کر کے دفتر سے نکل آئی۔ چند لمحوں بعد دونوں ایمبیسی کے باہر کھڑے تھے۔ احمد نے پوچھا، ''ہمیں کسی پارک کا رخ کرنا چاہیے یا ہوٹل کا؟''

اس نے کندھے اچکائے، بولی، ''میں اس بارے میں موزوں جواب نہیں رکھتی۔''

’’قریب ترین ہوٹل بہت مہنگے ہیں۔ چونکہ میرے پاس اتنی زیادہ رقم نہیں ہے، اس لیے ہمیں تھوڑا دور جانا پڑے گا۔ اگر تم مناسب خیال کرو تو ہمیں دو چار گھنٹے گزارنے کے لئے مانومنٹ کی سیر کر لینی چاہیے۔‘‘

’’وہ کیا ہے؟‘‘ سنبل چونکی۔

’’ایک ثقافتی اور تفریحی مقام ہے۔‘‘ احمد نے اس کا اشتیاق جگایا۔ وہ تیار ہو گئی۔

تین گھنٹے گزرتے دیر نہیں لگی۔ سنبل نے کہا، ’’ماحول نے لطف دیا مگر تم نے بور کیا۔ میں سمجھتی ہوں کہ تمہیں میرا واپس جانے اور سندربن نہ جانے کا فیصلہ پسند نہیں آیا۔‘‘

اس نے جواب دیا، ’’نہیں! ایسی بات نہیں ہے۔ تم جو کرنا چاہو گی، میں اس میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ اب ہمیں کال پوائنٹ پر جا کر تمہارے آفیسر سے رابطہ کرنا چاہیے۔ اس نے یقیناً تمہاری سیکورٹی اور رہائش کا بندوبست کر دیا ہو گا۔‘‘

سنبل نے اقرار میں سر ہلایا۔ کال پوائنٹ پر پہنچ کر احمد نے نمبر ملایا۔ ریسیور سنبل کو تھمایا۔ ایکسچینج کے خودکار کمپیوٹر کی محفوظ شدہ آواز سنائی دی، ’’برٹش ایمبیسی فار......‘‘

اس نے کمپیوٹر پر دی جانے والی ہدایات کے مطابق مختلف بٹن پش کیے۔ آفیسر سے رابطہ ہونے پر اپنا نام بتایا۔ اس نے کہا، ’’تمہاری تصدیق کر لی گئی ہے۔ تمہارے لیے ایک ہوٹل میں کمرہ ریزرو کرا دیا گیا ہے۔ ہوٹل کا نام اور روم نمبر نوٹ کر لو۔ وہاں تمہاری حفاظت کا مناسب انتظام موجود ہے۔ اگلی اطلاعات تمہیں وہیں بہم پہنچائی جائیں گی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق پرسوں شام کو ٹیک آف کرنے والی فلائیٹ میں تم گریٹ کنٹری روانہ ہو جاؤ گی۔ وِش یو گڈ لک......‘‘

احمد بھی ریسیور سے کان لگائے آفیسر کی ہدایات سن رہا تھا۔ اس نے کاغذ نہ پا کر اپنی ہتھیلی پر ہوٹل کا نام اور کمرہ نمبر لکھ لیا تھا۔ کال پوائنٹ سے نکل کر احمد کی نظریں ٹیکسی کی تلاش میں ادھر ادھر گھومنے لگیں۔

ٹیکسی میں ہوٹل کی طرف عازمِ سفر سنبل کے گویا دماغ سے بہت بڑا بوجھ اتر چکا تھا۔ مسکرا کر بولی، ’’کیا میں نقاب کر لوں؟‘‘

احمد نے کہا، ’’ہاں! کیونکہ اس میں تم بہت اچھی لگتی ہو۔‘‘

❀❀❀

ائرپورٹ کے لاؤنج میں دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ سنبل کے کندھے پر ایک قدرے بڑا پرس جھول رہا تھا۔ چند قدموں کے فاصلے پر ایک پولیس مین گن تھامے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ سفارت خانے کے تین اہلکار تھے جو سنبل اور احمد کو ہوٹل سے ائرپورٹ لائے تھے۔

احمد مطمئن تھا کہ چھ بجے کی فلائیٹ کے زمین چھوڑتے ہی اس کی خودساختہ ذمہ داری بہ احسن انجام پذیر ہو جائے گی۔اس کے باوجود اس کا چہرہ روشن نہیں تھا۔وہ پہلے کی طرح چہک نہیں رہا تھا۔سنبل ائرپورٹ پر آنے سے قبل بہت خوش تھی۔کئی مرتبہ زبانی اور تین مرتبہ عملی طور پر اس کا شکریہ ادا کر چکی تھی۔

کافی سارا وقت بے عنوان خاموشی کی نذر ہو گیا۔سنبل نے لب کشائی کی،''احمد! کیا ہمیں جدا ہونے کے آداب بھی معلوم نہیں یا اب ہمارے پاس گفتگو کے لیے کوئی موضوع ہی نہیں رہا۔''

احمد مسکرایا۔بولا،''نہیں سنبل! میں بہت خوش ہوں کہ میری محنت تمہارے کام آگئی اور تم بہ حفاظت اپنے وطن سدھار رہی ہو۔''

''کیا تم واقعی خوش ہو؟''سنبل نے سنجیدگی بھری نگاہیں اس پر مرکوز کر دیں۔

وہ چونکا،بولا''ہاں تو......مگر تم نے ایسا کیا محسوس کیا ہے؟''

سنبل نے سر جھکا لیا۔اٹھایا تو احمد بھونچکا رہ گیا۔اس کی خوبصورت آنکھوں میں دو ننھے ننھے ستارے چمک رہے تھے۔نم آواز میں بولی،''میں ایک ہی وقت میں کامیاب فرار پر خوشی محسوس کر رہی ہوں اور شکست پر غم زدہ ہو رہی ہوں۔''

اس نے سنبل کا ہاتھ تھاما۔تھوڑا دبایا۔سمجھایا،''تم جاتے ہوئے دل گرفتہ مت ہو سنبل! یہ زندگی ہے۔کبھی ہار کبھی جیت۔سب چلتا رہتا ہے۔پربت شاہ اکیلا نہیں ہے،یہاں اس قماش کے لاکھوں افراد ہیں جن کی وجہ سے کروڑوں غریبوں کا جینا محال ہو کر رہ گیا ہے۔تم اگر ایک پربت شاہ سے جیت بھی جاتیں تو کچھ بڑا کام نہ ہوتا۔تم موت کی وادی سے زندہ نکل رہی ہو،تمہارے نزدیک یہی سب سے بڑی کامیابی ہونی چاہیے۔''

سنبل اس کے ایک ایک لفظ کو لبوں پر سے تھام رہی تھی۔اس کے سرخ تر ہونٹ کپکپائے،''نہیں احمد! میں اس شکست کی بات نہیں کر رہی ہوں۔''

وہ استعجاب انداز میں گویا ہوا،''کیا مطلب؟ تم پھر کس کی بات کر رہی ہو؟''

اس نے اپنا آزاد ہاتھ اٹھایا۔اس کے سینے پر انگلی رکھی۔بولی،''مجھے تم نے ہرا دیا ہے احمد! میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کسی لالچ کے بغیر کوئی شخص دنیا میں کسی دوسرے کے کام بھی آتا ہوگا۔''

اس نے گہری سانس لی اور مسکرانے پر اکتفا کیا۔بولا،''سنبل! پاکستان بہت خوب صورت اور مکمل ملک ہے۔تم نے اس کا حسن نہیں دیکھا۔بدقسمتی سے تمہارا طیارہ گندگی کے ڈھیر پر لینڈ کر گیا تھا۔تم نے جو دیکھا،وہ پاکستان نہیں تھا۔یہ اپنے ذہن میں لے کر جانا۔''

وہ اسے اتنے غور سے دیکھ رہی تھی کہ اسے نظریں چرانا پڑیں۔ وہ بولی، ''ابھی فلائیٹ میں کچھ دیر باقی ہے۔ تم میری طرف دیکھو ناں!''

اس نے دیکھا۔ دل کٹ کر رہ گیا۔ چند ہی لمحوں میں دمکتا چہرہ دہک کر بجھنے لگا تھا۔ وہ سمجھ گیا۔ جدائی اس پر قیامت توڑ رہی تھی۔ اس کا ہلکی آنچ میں دہکتا ہوا ہاتھ چھوڑ کر ایک قدم پیچھے ہٹا۔ بولا، ''تم جا رہی ہو۔ فی امان اللہ! مگر یہ دھیان رکھنا کہ تم نے میرے پہلو میں کھڑے ہو کر نماز پڑھی تھی۔ اپنی خواہش سے پڑھی تھی اور میں نے تمہیں ایسا کرنے کا نہیں کہا تھا۔ بس...... پڑھتے رہنا......اسے پڑھنے کے بعد قائم کرنا پڑتا ہے۔ میں نے سچ کہا تھا کہ یہ برائی سے بچاتی ہے۔ اچھائی کی طرف لے جاتی ہے۔ دنیا کو اس کی اشد ضرورت ہے۔''

سنبل لمحاتی سوچ میں اتری۔ احمد نے درست کہا تھا۔ ایسے میں دل سے بولی، ''تھینک یو احمد! یہ تمہارا دوسرا احسان ہے مجھ پر...... میں نے دوراہا چھوڑ دیا ہے۔ اب میں مسلمان ہوں۔ صرف مسلمان...... میں نماز پڑھوں گی...... نہیں بلکہ قائم کروں گی۔ مگر...... مگر......''

اس کا لہجہ بھرا گیا۔ ایسے میں لاؤنج میں سرگوشی جیسے اناؤنسمنٹ گونجنے لگی۔ اس کی فلائیٹ تیار تھی۔ ایک جھٹکے سے احمد کی طرف بڑھی۔ لپٹ گئی۔ اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس کے سیاہ پڑتے ہونٹ چومنے لگی۔ اس کی یہ حرکت غیر اضطراری تھی۔ غیر ارادی تھی۔ کپکپاتے وجود کو اس کا حصہ بنائے رونے لگی۔ کہنے لگی، ''تم خود غرض ہو احمد۔ اگر یہ ملک اتنا ہی اچھا ہے تو تمہاری زبان نے ایک مرتبہ بھی مجھے یہاں رہ جانے کا مشورہ کیوں نہیں دیا...... تم نے یہ چاہا ہی نہیں کہ میں تمہارے وطن میں رہ جاؤں...... نہ ہمیشہ کے لیے، نہ چند دنوں کے لیے...... تم نے تو بس یہ چاہا کہ میں یہاں سے فوراً چلی جاؤں......''

اس پر عجیب نوع کی ہسٹریائی کیفیت سوار تھی۔ احمد نے کچھ کہنا چاہا۔ اسے پرسکون کرنا چاہا مگر اس کی آواز بلند ہونے لگی، ''احمد! تم نے میری خاطر جان ہتھیلی پر رکھ دی۔ سچ کہا تھا تم نے کہ تم نے سینہ پھاڑ کر مجھے اسلام آباد پہنچایا مگر پھٹے ہوئے سینے میں میرا نام تک نہیں لکھا...... ہائے احمد! تم پتھریلے علاقے کے پتھر دل انسان ہو۔ تم نے تو مجھے عورت اور خود کو مرد ہی نہیں سمجھا...... کیوں؟...... کیوں میں تمہاری محبت کے قابل نہیں ثابت ہوئی؟''

احمد کا بدن سن رہ گیا۔ اس نے سنبل کا چہرہ دیکھنا چاہا مگر وہ اس کے سینے میں گھسا ہوا تھا۔ بال ہونٹوں پر سرسرا رہے تھے۔ چھت میں نصب لائٹس کی روشنی میں بالوں کی ایک لٹ کچھ زیادہ ہی چمک رہی تھی۔ اس نے اسے ہونٹوں سے لگا لیا۔ زبان سے چھو کر منہ میں بھر لیا۔ سنبل کی لرزش بار آواز کافی مدھم ہو گئی تھی۔ دل سن رہا تھا، ''احمد! میں نے پہلی مرتبہ تمہارے سینے سے لگنے کے بعد محبت کا پیام قبول

کرلیا تھا۔تم نے بیسیوں مرتبہ مجھے دل سے لگا کر پرے ہٹا دیا۔نہیں سمجھ پائی، تم کیا ہو؟......''

پھر کانوں میں سنبل کی آواز اتری، ''بتاؤ ناں......اگر تمہیں مجھ سے محبت نہیں تھی تو تم نے سوتے میں میرا ہاتھ کیوں چوما تھا؟''

ایسے میں احمد کو احساس ہوا کہ الوداعی ملاقات سنبل کا راستہ کھوٹا کرنے لگی تھی۔اس نے آہستگی سے اسے خود سے علیحدہ کیا اور پسنجر گیلری کی طرف اشارہ کیا۔کہا، ''سنبل! خود کو سنبھالو۔ان سوالوں کے جواب میرے پاس بھی نہیں ہیں۔گڈ بائی......''

سفارت خانے کے ایک طویل قامت اہلکار نے قدم بڑھائے۔سنبل کے پاس آکر انگریزی میں مخاطب ہوا، ''میڈم! فلائیٹ تیار ہے۔اب تمہیں چلنا چاہیے۔''

وہ چند الٹے قدم چل کر رکی۔چاہا کہ دوڑ کر احمد تک آئے مگر ایک ہی فیملی کے چار پانچ افراد کے گھیرے میں آ گئی۔ان کے جلو میں پسنجر گیٹ کی طرف دھکیل دی گئی۔جب تک احمد دکھائی دیتا رہا، الٹے قدموں چلتی رہی پھر دونوں ایک دوسرے کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔احمد نے ستون کا سہارا لیا۔کچھ دیر سر جھکائے کھڑا رہا پھر بالکونی کی طرف چلا گیا۔جب سنبل پسنجر بس سے نکل کر جہاز کے دروازے سے لگی سیڑھیوں والی گاڑی کی طرف بڑھی، احمد کو نظر آئی۔اس نے کھڑے ہو کر لاؤنج کی طرف دیکھا۔اس کی آنکھیں کچھ دیر احمد کو تلاش کرتی رہیں پھر اس کا ہاتھ ہلنے لگا۔احمد نے بھی آہستگی سے ہاتھ اٹھا دیا۔سفارت خانے کے اہلکار اور گارڈ پسنجر بس میں سوار ہو گئے۔ایک ایک کر کے مسافر بھی پلین میں سوار ہو گئے۔وہ بھی اوجھل ہو گئی۔خودکار انداز میں بند ہوتے دروازے میں ائر ہوسٹس کا لہراتا ہوا ہاتھ آخری منظر کے طور پر ثبت ہو گیا۔احمد ریلنگ تھام کر جھکا کھڑا تھا۔اس کے ہاتھوں کی پشت پر موٹی موٹی رگیں نمایاں تھیں جبکہ آنکھوں میں خوفناک اندھیرے کا راج تھا۔جہاز رن وے پر سرکا اور اس کا سائز بتدریج چھوٹا ہوتا گیا۔یہاں تک کہ بہت دور جا کر اس نے زمین چھوڑ دی۔وہ بڑبڑایا، ''خدا حافظ سنبل!''

جہاز نظروں سے اوجھل ہو گیا تو پژمردہ قدموں سے ویٹنگ لاؤنج میں آیا۔ایک دروازے سے گارڈ اور سفارت خانے کے لوگ داخل ہو رہے تھے۔دوسرے دروازے سے احمد نکل رہا تھا۔ٹیکسی کی تلاش میں چند قدم چلا۔ایسے میں بڑبڑایا، ''یار احمد! جانے والی تو چلی گئی......تم بھی اپنے سندربن کا رخ کرو۔تمہاری گاڑی اور سامان تمہارا انتظار کر رہا ہے۔چل بابا......''

❀❀❀

سنبل کو سنڈرلینڈ آئے دو ماہ بیت گئے تھے۔دماغ پر نفسیاتی مرض کی طرح حملہ کرنے والے سندربن کے واقعات کے ہولناک تاثرات مدھم ہو گئے تھے۔آج وہ ڈیوٹی سے لوٹی تو اسے کمپیوٹر کا خیال آیا۔اپنی عادت کے مطابق اس نے ٹشو پیپرز کی مدد سے کمپیوٹر کی صفائی کی۔آن کیا۔فیس بک کھولی۔ڈھیر سارے پیغامات اور تصاویر اس کے انتظار میں تھیں۔اس نے پہلے تصاویر دیکھنے کا ارادہ کیا۔

ایسے میں ہلکی سی مانوس بیپ کے ساتھ چیٹ روم کا چوکھٹا کھل گیا۔ اس نے دیکھا۔ سمیر آن نیٹ تھا۔ اسے 'سلام' کہہ رہا تھا۔ اس کی توجہ سمیر کی طرف مبذول ہوگئی۔ اس نے لکھا تھا، ''ڈیئر سنبل! میں کافی دنوں سے ٹرائی کر رہا ہوں مگر تم نے فیس بک پر آنا ہی چھوڑ رکھا ہے۔ خیر تو ہے نا؟''

اس نے لکھا، ''مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی۔ تم کیا کر رہے ہو؟ رقیہ کیسی ہے؟''

سمیر نے کہا، ''تمہیں حیرانی کی ایک بات بتانی ہے۔ دس دن قبل پربت شاہ کا سب سے چھوٹا بیٹا جمال شاہ ہمارے سکول آیا تھا۔ وہ سکول کی ہیڈ مسٹریس سے ملا۔ آپی رقیہ سے بھی۔ پتہ ہے اس نے کیا کیا؟''

وہ منہ بنا کر بولی، ''کوئی غلط کام ہی کیا ہوگا۔''

''نہیں ڈیئر...... اس نے سندر بن کے دو نئے بچوں کو سکول میں داخل کرایا۔ سکول میں چوبیس بچے بچیاں پڑھتی ہیں۔ ان تمام کی سال بھر کی فیس ادا کی۔ اپنی جیپ میں تمام بچوں کے لیے ان سلی یونیفارم بھر کر لایا تھا۔ اپنے ہاتھوں بانٹ کر گیا ہے۔ ہے ناں حیرانی کی بات؟''

اسے سمیر کے لکھے پر یقین نہیں آیا۔ بولی، ''ناممکن...... میں نہیں مان سکتی۔ اس نے تمہاری آپی یا کسی اور ٹیچر کے لیے......''

''نہیں ڈیئر...... یہی تو بڑی بات ہے۔ اس نے سکول میں تقریر بھی کی۔ آپی کو 'باجی' کہہ کر پکارا۔ ٹھہرو...... میرے پاس اس کی یونیفارم بانٹنے کی کئی فوٹو موجود ہیں۔ چند ایک ٹیگ کر دی تھیں جو یقیناً تم نے نہیں دیکھیں۔ ان میں سے ایک کا لنک بھیجتا ہوں۔ کلک کر کے دیکھ لو۔''

چند لمحوں بعد چیٹ باکس میں تین سطری لنک ابھرا۔ سنبل نے کلک کیا۔ فل سکرین پر ایک تصویر دھندلائی پھر واضح ہوئی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی سنبل کے بدن کو گویا بجلی کا جھٹکا لگا۔ وہ کرسی میں بیٹھی نہ رہ سکی۔ کھڑی ہوگئی۔ جلدی سے آنکھیں ملیں اور جھک کر اپنا چہرہ ایل سی ڈی کے برابر جھکایا۔ تصویر کو دیکھا، بے اختیار لبوں سے نکلا، ''احمد...... یہ تو احمد ہے...... جمال شاہ تو نہیں ہے......''

وہ بے جان انداز میں کرسی میں ڈھے گئی۔ تصویر کے نیچے سمیر نے لکھا رکھا تھا، ''ڈیئر! یہ شاہ سائیں کا چھوٹا بیٹا جمال شاہ ہے...... اس کا پورا نام احمد جمال شاہ...... دو ماہ پہلے اپنی پڑھائی مکمل کر کے لاہور سے سندر بن آیا تھا۔''

سنبل کا ہاتھ دل پر جا ٹکا۔ یوں لگا جیسے دھڑکنا ہی بھول گیا ہو۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں احمد کی تصویر پر جمی ہوئی تھیں اور ہونٹوں کی سرخی میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ کافی دیر اسی طرح بیٹھی رہی پھر تھکے تھکے انداز میں اٹھی اور وضو کرنے کے لیے واش بیسن کی طرف بڑھ گئی۔

وہ بالکل احمد کے انداز میں خودکلامی کر رہی تھی، ’’کیوں احمد! تم نے مجھے اتنا بڑا دھوکہ دیا...... مجھے توڑ کر رکھ دیا...... نہیں...... نہیں...... تم اتنے بڑے جھوٹے ہو گے؟ یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا...... مگر نہیں...... تم نے مجھ سے جھوٹ تو کوئی بولا ہی نہیں تھا...... بس اپنا آپ مجھ سے چھپایا تھا اور خود کو اس طرح چھپانا جھوٹ بولنے سے بھی برا ثابت ہوا......‘‘

چہرے پر ہاتھوں کے پیالے میں بھرے ہوئے پانی کا پہلا چھینٹا پڑا...... پھر دوسرا...... پھر تیسرا...... یہیں کہیں اس کی مزاحمتوں نے دم توڑ دیا اور وہ نڈھال سی ہو کر وضو کرنے لگی۔ ایک دم بند آنکھوں کے عقب میں ذہن روشن ہو گیا اور اس کے دل کو جیسے قرار سا آ گیا۔

...◉...

**ختم شد**